ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

مدیر مسئول:

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۸۵۲۶۱۱

وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً

(البقرہ: ۲۶۹)

ماھنامہ

حِکمتِ قرآن

لاھور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاھور ۱۴

فون: ۸۵۳۶۱۱

زرِ سالانہ /۲۰ روپے

اس شمارے کی قیمت -/۲

فہرس

جلد اوّل | ربیع الاوّل ۱۴۰۳ھ مطابق جنوری ۱۹۸۳ء | شمارہ: ۱۱

★ حرفِ اوّل ——— ۳
حافظ عاکف سعید

★ حکم وعبر ——— ۵
ڈاکٹر ابصار احمد

★ قرآنِ حکیم اور اصلاحِ معاشرہ ——— ۹
جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

★ وحدتِ ملّی کی اساس — قرآن مجید ——— ۱۷
حافظ احمد یار

★ قرآن اور اصلاحِ معاشرہ ——— ۲۳
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

★ مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام ——— ۲۷
مولانا محمد طاسین

ڈاکٹر اسرار احمد

طابع: ایس اے سلیم ، مطبع: آفتاب عام پریس لاہور

عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

حسبِ وعدہ 'حکمتِ قرآن' بابت جنوری ۸۳ء حاضرِ خدمت ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے الحمدللہ کہ ۸۲ء میں اس نے اپنی زندگی کے دس سال مکمل کر لئے۔ انجمن کے وابستگان کی عظیم اکثریت بحمداللہ نہ 'یوم' منانے کی قائل ہے نہ 'جشن' منانے کی، تاہم چونکہ ادھر دو تین سال سے 'سالانہ قرآن کانفرنسوں' کا سلسلہ بھی بندھ چکا ہے اور اس کی جگہ 'محاضراتِ قرآنی' کا انعقاد 'قرآن اکیڈمی' میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس دوران میں وسطِ شہر لاہور میں انجمن کے زیرِ اہتمام کوئی بڑا اجتماع نہیں ہو سکا جس کے باعث ایک خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ انجمن کی مجلسِ منتظمہ نے طے کیا کہ انجمن کی دس سالہ تقریبات منائی جائیں۔ جن کا سلسلہ جمعہ ۱۲ نومبر سے اتوار ۲۱ نومبر ۸۲ء تک دس روز جاری رہا۔

ان تقریبات کا آغاز جمعہ ۱۲ نومبر کو مسجد دارالسلام باغ جناح میں قبل از نمازِ جمعہ انجمن کے صدر مؤسس والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطاب سے ہوا۔ جس میں انہوں نے انجمن کے قیام کے پس منظر اور اس کے پیشِ نظر مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اسی شام کو بعد از نمازِ مغرب جناح (ٹاؤن) ہال لاہور میں جہاں متعدد 'سالانہ قرآن کانفرنسیں' منعقد ہو چکی ہیں ایک اجلاسِ عام ہوا۔ جس میں شرکاء کی کثرتِ تعداد اور ان کے ذوق شوق نے واقعتہً 'قرآن کانفرنسوں' کی یاد تازہ کر دی ——— اس اجلاس کی صدارت کے لئے مولانا سید وصی مظہر ندوی مہتمم جامعہ سلامیہ اور میئر بلدیہ حیدرآباد بطور خاص تشریف لائے۔ اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب چیئرمین کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی نے محفل کو زینتِ بخشی۔

مقالات اور تقاریر کے لئے دو موضوع متعین تھے: ایک 'عظمتِ
قرآن' اور دوسرے 'اصلاحِ معاشرہ اور قرآنِ حکیم' ——— ان موضوعات
پر نہایت مؤثر اور فکر انگیز تقاریر تو علامہ سید غلام شبیر بخاری، پروفیسر مرزا محمد منور،
ڈاکٹر اسرار احمد اور صاحبِ صدر کی ہوئیں ——— ان کو مرتب کرنا تو بجائے خود
ایک بہت بڑا کام ہے، اگر اللہ نے چاہا تو یہ آئندہ کبھی ہدیۂ قارئین ہو جائیں گی
——— مقالات میں سے تین اس بار شائع کئے جا رہے ہیں۔ ایک ان شاء اللہ
آئندہ شمارے میں شائع کر دیا جائے گا۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا درسِ قرآن
مسلسل دس دن جاری رہا۔ پہلے تین دن مسجد شہداء، ریگل چوک میں، جہاں
روزانہ عصر سے لے کر مغرب تا عشاء تک دو نشستوں میں سورۂ حج کے آخری
رکوع کی چھ آیات کا درس مکمل ہوا ——— اور اس کے بعد مسلسل چھ دن یہ درس
جناح ہال ہی میں ہوا جہاں روزانہ دو ڈیڑھ دو گھنٹے کی نشستیں رہیں اور
چار دن میں سورۂ حدید، ایک نشست میں سورۂ صف اور آخری دن سورۂ
جمعہ کے پہلے رکوع کا درس ہوا۔

درسِ قرآن کی ان نشستوں میں حاضری حیران کن رہی اور الحمد للہ کہ جیسے
جیسے سلسلہ آگے بڑھا درس کے شرکاء کی تعداد اور ان کے ذوق و شوق میں اضافہ ہی
ہوتا چلا گیا ——— چنانچہ ٹاؤن ہال میں فی الواقع تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی تھی۔
اور اضافی نشستوں کے امکانی حد تک اہتمام کے باوجود ایک کثیر تعداد میں لوگ زمین
پر بیٹھ کر درس سنتے تھے ——— اللہ تعالیٰ اس ذوق و شوق کو بابرکت اور نتیجہ خیز
بنائے۔ آمین ثم آمین!

مولانا محمد طاسین [illegible] معروف اور محترم [illegible]
[illegible] بالخصوص [illegible] تحقیق کیا اپنا موضوع [illegible]
[illegible] ایسے اہم [illegible]
[illegible] میں خدمت مدیر صرف کی ہے ——— [illegible] شمارے سے ان [illegible]

باقی ص ۲۸ پر

ابصار احمد

حکم و عبر

پچھلے شمارے میں ہم نے اخلاقیات اور مذہبی عقیدے کے ربط و تعلق کا سوال اٹھایا تھا۔ اور اس ضمن میں قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں دین اسلام کے موقف کی وضاحت کی تھی۔ تاریخ فلسفہ اخلاق کے حوالے سے آخر کلام میں یہ بات کہی گئی تھی کہ بہت سے جدید مغربی مفکرین نے انسان کی اخلاقی حس کو مذہبی شعور کا ایک اہم جزو تصور کیا ہے اور بعض دوسرے مفکرین نے ایک قابل عمل اخلاقی لائحہ عمل کے لئے مذہب کے بعد الطبیعاتی عقاید کو ناگزیر قرار دیا ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جانوروں پر بالعموم اخلاقی حدود و قیود کا اطلاق نہیں ہوتا۔ حیوانات و بہائم کی دنیا میں بعض جانور دوسرے جانوروں کی خوراک بنتے ہیں۔ شیر ایک بکری کو ہلاک کر کے اس کی تکہ بوٹی کرے اور اس کا خون پی جائے تو کسی کو یہ بات عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ اور نہ اس کے لئے کوئی تعزیری قانون بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر یہی فعل ایک انسان اپنی ہوس کی تکمیل کے لئے کرتا ہے تو ساری انسانیت اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ قاتل کو اسکے قبیح فعل کی پوری سزا دی جائے۔ مشہور ناول نگار دوستوفسکی (Dostoevsky) کے ناول "جرم و سزا" کا ہیرو جب ایک لالچی اور بوڑھی عورت کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی روز افزوں مگر بیکار دولت کو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنا سکے۔ تو نہ صرف ناول کے سارے کردار بلکہ کتاب کے تمام قاری بھی اسے مجرم قرار دیتے ہیں اور حصول علم کی قدر کرتے ہوئے بھی اس کے اس فعل کو جائز قرار نہیں دیتے کہ وہ ایک دوسرے انسان کی متاع حیات کل کر کے اس کی

دو نت سنبھالے۔ جانوروں اور انسانوں کے عمل سے متعلق ہمارے ردِ عمل میں اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ انسان کے متعلق بجا طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود ہے۔ اس کے ہر فعل کو صحیح اور غلط یا خیر اور شر کی میزان پر تولا جاتا ہے۔ جبکہ جانور اس قسم کا کوئی شعور اپنے اندر نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں صرف مفید اور مضر (Useful and harmful) کی تقسیم ہے۔ اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ جانور ہر وہ کام کر گزرتے ہیں جس سے ان کی وقتی ضرورت اور جبلی اشتہا پوری ہو۔ اور صرف مضرت کا خیال بعض دوسرے افعال سے انہیں باز رکھتا ہے۔ اس کے برعکس انسان میں از روئے قرآن ایک بنیادی اخلاقی حس ودیعت کی گئی ہے جس کے نتیجے میں وہ بعض افعال کو صحیح و جائز اور بعض دوسرے افعال کو غلط اور ناروا قرار دیتا ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَ — پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور
تَقْوٰىهَا (آیت ۸، سورۃ الشمس) — بچکر چلنے کی۔

معلوم ہوا کہ انسان کے لئے ایک ایسے ضابطہ اخلاق کی ازبس ضرورت ہے جس میں اس کے اخلاقی شعور کے مطابق صحیح اور غلط کو متعین کیا گیا ہو۔ اور اس کی بنیاد پر معاشرتی اور تعزیری قوانین وضع کئے جائیں۔ مگر یہاں انتہائی اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان خود اپنی علمی کاوش سے اس قسم کا قانون وضع کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انسانی فکر کی تاریخ شاہد ہے کہ بہترین انسانی دماغ ہزاروں برس کی کوشش کے باوجود اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس ناکامی کا برملا اعلان مشہور مغربی عالم قانون پیٹن ان الفاظ میں کرتا ہے:

"یہ امر مشتبہ ہے کہ کوئی فلسفہ کبھی بھی فرد اور جماعت کے درمیان اخلاقی تعلقات (Ethical Relationship) کے مسئلہ کو حل کر سکے گا۔ اگر ہم فرد کو بذات خود اصل قرار دیں تو اس کے ساتھ ہمیں یہ اقرار بھی کرنا پڑے گا کہ شخصیتوں کا واقعی نشو و نما کسی اجتماع کے اندر ہی ممکن ہے۔ مگر اجتماع سماجی منتہا (Social ends) کو حاصل کرنے کے لئے افراد سے کتنی قربانی لے سکتا ہے، ایک کا مفاد کل کے مفاد کے لئے کتنا قربان کیا جا سکتا ہے۔ ان

سوالات کا جواب ہمیں معلوم نہیں)"[1]

"تاریخ فکر انسانی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اخلاقی اقدار اور انسانی اعمال میں خیر و شر کا تعین جملہ فلسفیانہ مسائل سے مربوط ہیں اور انہیں ان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اخلاقی مسئلہ بلاواسطہ متعلق ہے ان سوالات سے کہ اس عظیم وسیع اور وسعت پذیر کائنات میں ابن آدم کا مرتبہ و مقام کیا ہے؟ اور وہ کس حیثیت میں یہاں موجود ہے؟ انسان کو جو ذہنی، فکری اور جسمانی صلاحیتیں حاصل ہیں ان کی کارکردگی اور ان کی رسائی کے حدود کیا ہیں؟ یہ کائنات درحقیقت کیا ہے؟ اور اس میں پائے جانے والے اور اسے تسخیر کر لینے کی شدید خواہش رکھنے والے انسانی وجود کی ماہیت کیا ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں کہ جو انسانی ذہن میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ انسان نے ان سوالات کا جواب پانے کی اپنی سی کوشش ہر دور میں جاری رکھی ہے۔ فلاسفہ اور حکمائے ان سوالات کا کھوج لگانے اور ان کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش ماضی میں بھی کی اور آج بھی یہ مسائل عقلی علوم کے بنیادی اور اہم ترین مسائل خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان مسائل کے بارے میں تاحال انسانی عقل کوئی حتمی رائے نہیں دے سکی ہے۔ بعض فلاسفہ نے اخلاقی اور سماجی مسائل کو اپنے طور پر ان بنیادی سوالات سے علیحدہ رکھ کر حل کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن ان کی یہ مساعی ہمیشہ بھونڈی اور غیر حقیقت پسندانہ ثابت ہوئیں۔ مثلاً بعض امریکی افادیت پسندی (Pragmatism) کے حامی مفکرین نے اخلاقی مسائل کو افادیت (Utility or Interest) کے حوالے سے طے کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان پر جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ یہ تمام تصورات بذات خود کچھ نہیں۔ بلکہ ان کی تہہ میں بھی بنیادی اقدار (Values) کا مسئلہ پورے طور پر سامنے آتا ہے"

اس حقیقت کا اعتراف پروفیسر پیٹن ان الفاظ میں کرتا ہے:

"وہ کون سے مفادات (Interest) ہیں جن کا تحفظ ایک معیاری

---

[1] Paton: A Text Book of Jurisprudence p.109

سماجی نظام کو کرنا ہے ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اقدار سے متعلق ہے اور وہ فلسفہ قانون کے دائرہ بحث میں آتا ہے - مگر اس معاملے میں ہم فلسفہ سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا ہی اس کا حصول مشکل معلوم ہوتا ہے - کوئی بھی قابل قبول پیمانہ اقدار (Scale of Values) اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے - درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اس کی ایک بنیاد پا سکتے ہیں - مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا وجدان کے تحت قبول کی جاتی ہیں نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر" +

مندرجہ بالا اقتباس سے اس امر کا کلی ثبوت مل جاتا ہے کہ مذہبی عقاید کے بغیر انسانی تمدن بے لنگر کے جہاز کی مانند ہو جاتا ہے چنانچہ مغرب کی ملحدانہ تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے - چنانچہ تغیر پذیری یا اضافیت (Relativism) کے نظریے نے انتہائی مضحکہ خیز اخلاقی نظریات کو جنم دیا ہے - مثلاً یورپ کی یونیورسٹیوں میں پچھلے پندرہ بیس سالوں کے دوران Situation Ethics کا بڑا غلغلہ رہا ہے - لیکن ناقدین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ نظریہ زیادہ سے زیادہ مخصوص احوال وظروف میں مفید ترین حکمت عملی کا مترادف تو ہو سکتا ہے لیکن اخلاقیات سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں کیونکہ اس مکتب فکر میں بعض بنیادی انسانی اقدار کو وقتی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے - *

اس بحث سے متعلق بعض دوسرے پہلوؤں پر ان شاء اللہ آئندہ کسی شمارے میں گفتگو ہوگی -

□□□□□□□

+ کتاب محولہ بالا صفحہ ۱۰۴

قرآن حکیم اور اصلاحِ معاشرہ

جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی دس سالہ تقریبِ تاسیس کے ضمن میں ۱۲ نومبر بروز جمعہ بعد نمازِ مغرب جناح ہال، لاہور میں "اصلاح معاشرہ اور قرآن حکیم" کے موضوع پر ایک مجلسِ مذاکرہ بصدارت جناب مولانا سید وصی مظہر ندوی مہتمم جامعہ اسلامیہ دمیر حیدرآباد منعقد ہوئی تھی۔ اس مجلس کے مہمانِ خصوصی جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب تھے اور موصوف نے حسبِ ذیل مقالہ اس مجلس میں پیش کیا تھا ——— (ادارہ)

انسان جس معاشرے میں رہتا ہے۔ یقیناً اس کی اصلاح کا فریضہ بھی خود اس پر عائد ہوتا ہے۔ گو اصول یہی ہے کہ ہر فرد اپنے افعال کا خود ذمہ دار اور جوابدہ ہے لیکن معاشرہ کے جو افراد نہ صرف خود بااختیار ہیں بلکہ بعض دوسرے افراد پر بھی بعض اعتبار سے اختیار رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری دوہری ہو جاتی ہے۔ ایک خود اپنی ذات کے بارے میں اور دوسری متعلقہ افراد کے تعلق سے۔ مثال کے طور پر والدین اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کی اصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ ایک حاکم اپنی رعایا کے عام اخلاق کی درستی اور اصلاح و تربیت کا ذمہ دار ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" یا "اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ" کہ خود اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ یا اسی طرح یہ کہ اپنے اہلِ خاندان، عزیز و اقارب کو عذابِ دوزخ سے ڈراؤ۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ کہ تم میں سے ہر ایک گلہ بان یعنی نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک جوابدہ ہے اپنے گلہ کے بارے میں

اسلام معاشرے کی اصلاح کو دو دائروں میں بیان کرتا ہے۔ ایک انفرادی سطح پر اور دوسرے اجتماعی سطح پر۔ چنانچہ اگر ایک طرف انسان کے ذمہ خود اپنی اصلاح ہے تو دوسری

طرف اس کے ذمہ معاشرہ کے دیگر افراد کی اصلاح کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ البتہ ایک خاص دائرہ میں یہ فریضہ مسلمانوں کے ایک گروہ کے سپرد ہے کہ وہ "داعی الی الخیر" ہو کر لوگوں کو خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ان کی اصلاح و تربیت کے کام میں مشغول رہیں۔

قرآن کا مقصود یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو دائروں میں اصلاحِ معاشرہ کے کام میں مشغول رہا جائے۔ اس کے لئے اگر علیحدہ وقت نہ مل سکے تو جس کام اور پیشے سے متعلق ہے اس میں خیر و اصلاح کے پہلو نکال کر نیکیوں کو پھیلاتا رہے۔ اللہ برکت دینے والا ہے۔ چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لئے اگر قرآنی ہدایات پر عمل کیا جائے اور خود کو بھی لوگوں کے سامنے عملی نمونہ بنا کر پیش کیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے اچھے اور مفید اثرات مرتب ہوں گے اور اصلاحِ معاشرہ کا کام مستحکم بنیاد اختیار کر سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم توحید و رسالت اور عقیدہ آخرت کو اصلاحِ معاشرہ کے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیت دیتا ہے۔ خاص طور پر عقیدۂ آخرت انسان کے بنیادی اعمال و افعال پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے، اس کا مقابلہ کوئی اور نظریہ یا عقیدہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا

"جس نے نیک کام کیا تو اس کا فائدہ اس کے اپنے لئے ہے اور جس کسی نے برائی کی وہ خود اس کے آگے آئے گی"

آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل کی بنیاد اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے تریاق کا کام کرتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے لئے صرف یہی دنیا اصل مقصود ہے اور ان کے پاس آخرت کا کوئی تصور موجود نہیں، وہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مصداق اس چند روزہ حیات کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ آخرت کی جزا و سزا کا کوئی تصور ان کے یہاں موجود نہیں۔ ان کو معاشرتی برائیوں اور اخلاقی جرائم کے ارتکاب سے باز رکھنے والی کوئی شے نظر نہیں آتی۔ اور اگر وہ کسی وقت ان برائیوں اور جرائم کے ارتکاب سے رُکے رہتے ہیں تو ایسا حکومت کے تحریری قوانین یا سوسائٹی کے اخلاقی دباؤ

کے تحت ہوتا ہے لیکن " چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند " کے مصداق خلوتوں اور رازدارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور پولیس کا انہیں کوئی خدشہ نہیں، انہیں کون سا امر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام اور مالی مفادات اور مادی منافع کو چھوڑ کر اخلاقی قدروں اور ضابطوں کی پابندی قبول کریں؟ وہ صرف عقیدۂ آخرت اور اللہ کا خوف ہی ہو سکتا ہے جو انسان کو اس کے ظاہر و باطن میں یکساں اخلاقی عمل اختیار کرنے پر اس کے قلب و ضمیر کو ہمہ وقت آمادہ و تیار رکھتا ہے۔

اس کیفیت کو اس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص تن تنہا ایک جنگل میں جا رہا ہے کہ راستے میں اسے ایک تھیلی پڑی ملتی ہے وہ اٹھا لیتا ہے۔ کھول کر دیکھتا ہے کہ وہ تھیلی کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے آس پاس کوئی فرد بشر موجود نہیں جو اس فعل کا گواہ ہو، تھیلی پر مالک کا پتہ بھی لکھا ہے۔ لیکن وہ خدا فراموش شخص اس تھیلی کو اٹھا کر خوشی خوشی اپنے گھر لے جاتا ہے اور خوب گل چھرّے اڑاتا ہے۔ اس کے برخلاف عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص جو اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام کاموں سے واقف ہے اور وہ ہماری تمام حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے ہمارے تمام افعال کے لکھنے کے لئے کراماً کاتبین مقرر کر رکھے ہیں۔ جو ہمارے ہر عمل کو لکھ رہے ہیں۔ ایسا شخص یا تو اس تھیلی کو وہیں پڑا رہنے دے گا یا اس کے مالک کو تلاش کر کے اس تک اس تھیلی کو پہنچا دے گا یا حکومت کے پاس جمع کرا دے گا۔ ان دونوں اشخاص کے درمیان نقطۂ امتیاز صرف عقیدۂ آخرت پر کامل ایمان ہے۔ یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پوری طرح عمل کرنے سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آیا کہ لوگ مسلمانوں کی صورتیں اور چال چلن دیکھ کر دل و جان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

اسلام معاشرے کی اصلاح کے لئے علم دین کے عمومی پہلو کو عام کرنے پر خاص زور دیتا ہے کیونکہ دین کا اصل مقصد بندہ اور اللہ کے درمیان تعلق کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ جس پر انسان کی عملی زندگی کی صحیح صورت گری کا دار و مدار ہے۔ اسلام صحیح سمت میں دل میں جذبۂ عمل کو بیدار کر کے یہ احساس اجاگر کرتا ہے کہ انسان اچھے اعمال کرے، معاشرے کے دوسرے افراد کو تکلیف نہ پہنچائے، دوسروں کے حقوق غصب نہ کرے۔ دوسروں

کے حقوق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمات نہ دائر کرے۔ جھوٹی گواہی نہ دے۔ اللہ اور اس کے رسول برحق کے فرمان کے خلاف حرام مال کھانے میں نہ لگے۔ دنیا کے ذلیل اور پست مقاصد کے حصول کے لئے شریعت کے خلاف طریقے اختیار نہ کرے۔

قرآن حکیم ایمان و عمل کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔ ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے۔ اور عمل تک پہنچ کر مکمل ہوتا ہے۔ ورنہ ناقص رہتا ہے۔ ایمان و عمل کا یہ التزام معاشرے کی پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے۔

اور یوں بھی یہ بات ماہرین عمرانیات اور نفسیات کے نزدیک مسلّم ہے کہ انسان کے افعال و اعمال کا اصل محرک اس کے خیالات ہوتے ہیں۔ اگر خیالات صالح ہیں تو ان کے زیر اثر جو افعال سرزد ہوں گے وہ بھی نیک اور صالح ہوں گے۔ اور اگر خیالات برے اور فاسد ہیں تو افعال اور اعمال بھی برے ہوں گے۔ اور یہ بات بھی ہم سب کو تسلیم ہے کہ خیالات کا مبدأ اور سرچشمہ دراصل اس کے عقائد ہوتے ہیں۔ جن کے تحت اس کے خیالات و تصورات تشکیل پاتے ہیں۔ اب اگر عقیدہ صالح ہو تو اس کی زندگی کے افعال و اعمال اس عقیدہ کے زیر اثر وقوع پذیر ہوں گے۔ چنانچہ عمل کی اصل ایمان ہے۔

ایمان کا بنیادی نکتہ اللہ کے وجود کو اس کی تمام صفات کے ساتھ تسلیم کرنا، احکم الحاکمین ماننا اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو خدا کا آخری پیغمبر ماننا اور عملاً آپ کے دین کو اپنی ساری زندگی میں جاری و ساری اور غالب کرنا ہے۔ اللہ کو احکم الحاکمین ماننے والا شخص کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ اللہ کو قادر مطلق ماننے والا شخص کسی شخص کو نفع و ضرر کا مالک نہیں سمجھتا۔ اللہ کو رازق حقیقی ماننے والا شخص یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں کوئی ذی روح ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سچا اور آخری نبی ماننے والا آپ کو ایک ماڈل اور نمونہ سمجھتا ہے اور اپنی زندگی آپ ہی کے بتائے ہوئے طریقے پر گذار کر دنیاوی برکات و حسنات حاصل کرتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ نماز کو قائم کرتا ہے۔ زکوٰۃ کے نظام کو اپنا کر حبِّ مال کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔ باہمی ہمدردی اور ضرورت مندوں کی مدد کے جذبۂ عمل کو پروان چڑھاتا ہے اور روزہ دوسروں کی غربت اور بھوک کا احساس دلاتا ہے۔ اور ایمان کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ ایمان کامل انسان کو اس دنیاوی زندگی میں معصیت و گناہ سے بچاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص گناہ و معصیت سے

بچتا ہے اس کی یہ دنیاوی زندگی امن و عافیت کا گہوارہ ہوتی ہے اور دنیا میں انسانی زندگی کے لئے جو مضر چیزیں ہیں وہ ان سے محفوظ رہتا ہے اور اللہ کی قائم کردہ حلال و حرام کی حدود کو قائم رکھ کر اس دنیا میں نفس مطمئنہ حاصل کرتا ہے۔ وہ ایمان کی روشنی میں زندگی کی کٹھن راہوں پر صبر و استقلال کے ساتھ چلنے کا سبق سیکھتا ہے کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ناظم حقیقی اللہ ہے جس کی مشیت کے بغیر اس دنیا کا کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ راضی بہ رضائے الٰہی ہو کر زندگی گزارنے کا سلیقہ جان جاتا ہے اور اس دنیاوی زندگی میں پستی یا محرومی کا احساس اسے جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا۔

ایک صاحبِ ایمان و ادراک شخص جنگ و امن، معیشت و سیاست اور تعلیم و ثقافت کے بارے میں سارے فیصلے ایمان کی روشنی میں کرتا ہے۔ آخرت میں جواب دہی کا تصور اسے دنیا میں انسانوں کے حقوق غصب کرنے سے روکتا ہے۔ اگر عقیدۂ آخرت نہ ہو اور جزا و سزا پر ایمان نہ ہو تو محض دنیاوی قوانین انسانوں کو باہم متحد اور ان میں اخوت و ہمدردی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انسانیت کی عالم گیر فلاح ہی ایمان پر ہے۔ ایمان ہی کے ذریعہ انسان کو اپنی ہستی اور اس کے مقام کا صحیح ادراک حاصل ہوتا ہے اور اس کے مقصدِ وجود اور دائرہ کار کا تعین ہوتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر اس پر نہ صرف دنیاوی برکات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بلکہ ایسے ہی بندوں کے لئے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي	"اے نفسِ مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف
إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي	راضی برضا ہو کر رجوع کر اور میرے
فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي	بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں
(پارہ ۳۰، سورۂ فجر، آیت نمبر ۲۷)	داخل ہو جا۔"

اصلاحِ معاشرہ کے لئے قرآنِ حکیم جس چیز پر زیادہ زور دیتا ہے وہ قول و فعل میں توافق (موافقت) و مطابقت ہے۔ فی زمانہ ہمارے یہاں اصلاحِ معاشرہ کی جو کوششیں کی جاتی ہیں ان کی ناکامی یا بہت کم کامیابی کی ایک خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے قول و فعل میں مطابقت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو قرآنِ حکیم تنبیہہ کرتا ہے کہ:

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ	تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل
مَقْتًا عِندَ اللَّهِ	نہیں کرتے۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت

بڑا گناہ ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک اور اصول قرآن حکیم میں یہ بیان ہوتا ہے کہ لوگوں کو خیر خواہی کے جذبہ اور موعظۃ حسنہ (اچھی نصیحت) کے ساتھ سمجھاؤ۔ انہیں اصلاح کیطرف راغب اور متوجہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ اچھے طریقے پر دلیلیں قائم کرو اور بحث کرو۔ کیونکہ کج بحثی اور کٹ حجتی سے بجائے فائدہ پہنچنے کے الٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اصلاح معاشرہ کے لئے اسلام اپنا ایک قانونی نظام بھی رکھتا ہے۔ قانون ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر متمدن انسانی معاشرہ کا تصور ممکن نہیں۔ قانون کے ذریعے معاشرہ کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔ فرائض ادا کئے جاتے ہیں۔ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ معاشرہ کے افراد جو مختلف پیشوں اور حیثیتوں کے حامل ہوتے ہیں، ایک نظام کے تحت قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں۔

دراصل انسانی زندگی کے تقاضے اس قدر گوناں گوں اور اس کی ضروریات اس قدر متنوع ہیں کہ معاشرہ کو ایک مضبوط قانونی نظام پر قائم کئے بغیر ان کی تکمیل نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جبکہ معاشرہ کا ہر فرد اپنے دل میں قانون کا احترام اور اس کی پیروی کا جذبہ رکھتا ہو۔

قانون کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک عمومی اور دوسرا خصوصی۔ عمومی سے میری مراد وہ قوانین ہیں جو کوئی حکومت ملک کے عام نظم و نسق، امن و امان اور معاشرہ کو انتشار اور افراتفری سے محفوظ رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً بناتی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق بلاتخصیص مذہب و ملت مملکت کے تمام باشندوں بلکہ غیر ملکیوں پر بھی یکساں طور پر ہوتا ہے۔ مملکت کے نظام کو مساوی اور عادلانہ بنیادوں پر چلانے کے لئے تمام شہریوں بلکہ غیر ملکیوں کے لئے ان سب قوانین اور ہدایات کا احترام ضروری ہے۔ اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے صرف ایک ہی استثناء ہے، وہ یہ کہ قوانین اور احکام اللہ کی معصیت پر مبنی نہ ہوں۔

"لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ"

"مخلوق پر کسی ایسے امر کی اطاعت واجب نہیں جس میں اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی معصیت ہوتی ہو"

قانون کا خصوصی پہلو، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اور اس سے میری مراد قانونِ شریعت ہے جو کتاب و سنّت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ پہلو اس وقت ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

اسلام بنیادی طور پر قانون کی حرمت و بزرگی اور اعزاز کا قائل ہے اور اس کی پیروی پر بڑا زور دیتا ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی، اسلام کے نظریہ کے مطابق ایک خاص قسم کے قاعدہ قرینے، نظم و ضبط اور آئین و قانون کے تابع ہے۔ خواہ زندگی کا عبادتی پہلو ہو یا معاملاتی۔ چنانچہ سورۃ النساء کی ۶۴ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

"ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے، اس لئے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے"

اگلی آیت میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

"تمہارے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو خوشی سے نہ مان لیں اس وقت تک مومن نہ ہوں گے"

مطلب یہ ہے کہ جو قاعدے اور ضابطے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم تک پہنچے ہیں ان کو جان و دل سے مانیں اور ان پر عمل کریں، ہم تب ہی صحیح معنی میں مومن کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی قانون یا قاعدہ کی حکمت اور بھید ہماری عقل و فہم میں نہ آئے لیکن محض اس بنا پر کہ وہ ہماری عقل و فہم میں نہیں آیا، اس کے ماننے اور پیروی کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سورۂ احزاب کی ۳۶ ویں آیت میں احترامِ قانون کے بارے میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ

اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ جب اللہ اور اس

يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ" کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کردیں تو اب ان مومنوں کو ان کے معاملات میں کوئی اختیار باقی نہیں ہے"

مطلب یہ ہے کہ جو امور اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے فیصل شدہ ہیں، وہ قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں اختلاف یا انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کرے اور ان کی پوری طرح پیروی کرے۔

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ سے پہلے اصلاح معاشرہ ضروری ہے اس کے بعد اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں ورنہ یہ موجودہ معاشرہ پر ظلم کے مترادف ہوگا۔ مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ اگر معاشرہ کی اصلاح اسلامی قوانین کے نفاذ سے قبل ہی ہوسکتی ہے تو پھر اسلامی قوانین کے نفاذ کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے؟

قانون بجائے خود اپنے اندر اصلاح کی قوت رکھتا ہے۔ وہ قوت اگرچہ سلبی (Negative) طور پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن بالآخر اس کا نتیجہ ایجابی (Positive) ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی قوانین کو اصلاح معاشرہ تک مؤخر کرنا اسلامی قوانین کی قوت اصلاح سے انکار کرنے کے مرادف ہے۔ حالانکہ اسلامی قانون جن حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے وہ حکمتیں اور مصلحتیں ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہیں جن کا مطالبہ ہمارا موجودہ معاشرہ ہم سے کر رہا ہے۔ فی الحقیقت یہ خیال ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف چند عبادات اور اسلامی قوانین صرف حدود و تعزیرات کا نام ہے۔

یہ خیال دراصل اس انگریز کی حکمت عملی سے ہمارے ذہنوں پر مسلط کیا گیا ہے جس کی غلامی سے سیاسی طور پر تو اگرچہ ہم آزاد ہو چکے ہیں لیکن فکری اور ذہنی طور پر ابھی آزاد ہونا باقی ہے۔ انگریزوں نے اسلام کو سرنگوں اور برباد کرنے کی جو منظم کوشش اور سازشیں اس برصغیر میں اپنے دور اقتدار میں کی ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا جو کہ آج ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ ان کو مسلمانوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا خطرہ تھا اس لئے انہوں نے چند مخصوص عبادات نماز روزہ وغیرہ میں مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ چونکہ ہم نے اسلام کا عمل دخل اپنی زندگی میں صرف ان عبادات تک محدود دیکھا، اس لئے صرف اس کو اسلام سمجھ بیٹھے۔

اسلامی قوانین کے ساتھ ساتھ اسلام کا عدالتی نظام بھی نافذ کرنا ضروری ہے اور اس

باقی صـ۲۶ پر

وحدتِ ملّی کی اساس - قرآن مجید

از قلم : حافظ احمد یار

جناب پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن کی دس سالہ تقریبات کے ضمن میں "اصلاحِ معاشرہ اور قرآنِ حکیم" کے موضوع پر ۱۲، نومبر ۱۹۸۲ء کو جناح ہال لاہور میں پیش کیا ——!!

حَامِداً وَّمُصَلِّیاً وَّمُسْتَعِیْذاً ! " وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا "

محترم حاضرین !

انسانی غور و فکر کے نتیجے میں اب یہ بات ایک سائنسی نظریہ کی صورت میں سامنے آچکی ہے کہ عالمِ موجودات اور اس نظامِ کائنات میں ہر چھوٹی بڑی شے کا وجود اس کے مرکز سے وابستہ ہے۔ ذرّہ (ATOM) کا وجود ایک مرکز (NUCLEAR) سے وابستہ ہے۔ زمین اور اس پر رہنے والی مخلوقات کی زندگی مرکزی کششِ ثقل کے سہارے قائم ہے۔ نظامِ شمسی ایک مرکز کی بناء پر استوار ہے اور اسی طرح بات آگے کہکشاں تک پہنچتی ہے۔

ذرّہ سے لے کر نظامہائے کہکشاں (GALACTIC SYSTEM) تک ہر جگہ اپنے اپنے مرکز کے گرد طواف کا ایک منظر پایا جاتا ہے۔ مرکز کے ٹوٹ جانے یا مرکز سے بے تعلق ہو جانے کے نتیجے میں تباہی اور بربادی ظہور میں آتی ہے ؎

چیست وحدت؟ جز وجودِ مرکزے ——— زندہ ہر شے در حدودِ مرکزے!!
ذاتِ شے بر ذرّہ ہا شد منقسم ——— ذرّہ ہا را مرکزے دارد بہم
ذرّہ ذرّہ سوئے مرکز می رود ——— الیکٹران آیون[1] گردِ یک مرکز دود
ثابت و سیارگاں را مرکز است ——— قطب را کہکشاں را مرکزے است

---

[1] مراد ہے آیونک تھیوری (IONIC THEORY)

هر یکے بینی بعشقے در طواف !! — گے کند از مرکزِ خود انحراف
هر نظامے راست مرکز در جہاں — مرکزے دارد ہم این کون ومکاں
گر کسے از مرکزش رو تافتے — نام خود ہم گم ز ہستی یافتے
ہر کہ دور از محورش مائل شود !! — چوں شہابے ہستی اش زائل شود

(مثنوی صمدانی)

جس طرح عالم حسی و طبیعی میں اشیاء کا وجود مختلف درجات میں کسی نہ کسی مرکز سے مربوط ہے۔ اسی طرح اشخاص و اقوام کا معنوی وجود بھی ہمیشہ کسی مرکز سے وابستہ ہوتا ہے یہ معنوی مرکز ہی اس کی بقاء اور اس کی تعمیر و ارتقاء کے لئے ایک مضبوط اساس مہیا کرتا ہے۔ اقوام و ملل میں اسی مرکز سے وابستگی کے باعث ایک احساسِ یک جہتی پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی احساسِ یک جہتی یا اخوت و اتحاد ایک ملت یا قوم کو دوسری ملتوں اور قوموں سے ممتاز کرتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تمام انسان دو ملتوں میں منقسم ہیں۔ یعنی اسلام کا نظریۂ ملت درحقیقت دو قومی نظریہ ہے۔ ایک طرف ملت اسلامیہ اور دوسری طرف الکفر ملة واحدة —— عجیب بات ہے کہ آج مسلمانانِ عالم —— یا کم از کم ان کی خود ساختہ قیادتیں —— وقت کے شدید ترین انتباہات کے باوجود، اپنے آپ کو ایک اور صرف ایک ملت سمجھنے سے قاصر ہیں یا کم از کم وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں نظر آتے۔ دوسری طرف وہ "ملتِ کفر" کو —— ملتِ اسلامیہ کے مقابل —— عداوتِ مسلم پر متحد و متفق ایک ہی ملت سمجھنے کی بجائے کسی نہ کسی ملتِ کافرہ سے "امیدِ غم گساری" رکھتے ہیں۔ کوئی ماسکو کے سہارے زندگی کی تلاش میں ہے اور کوئی واشنگٹن کی مہربانی کو اپنے لئے درازیٔ عمر کا بہانہ خیال کئے ہوئے ہے۔ کوئی ایک سُپر پاور کے دروازے پر حاضر ہے تو کوئی دوسری سُپر پاور کی دہلیز پر —— اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ مسلمان تو اپنی وحدت اور کفر کی وحدت کے تصور سے ناآشنا نظر آتا ہے۔ مگر غیر مسلم یا "ملتہائے کفر" تمام مسلمانوں کو ایک ہی ملت سمجھ کر اسے معدوم کرنے یا محکوم بنانے کی مساعی میں ایک متفقہ پروگرام پر عمل پیرا نظر آتی ہیں۔

ہنود و یہود اور روس و امریکہ سب عداوتِ مسلم پر متحد ہیں —— لبنان

ہو یا افغانستان، صومالیہ ہو یا ہندوستان، ارٹیریا ہو یا فلپائن ہر جگہ خونِ مسلم کی ارزانی دیکھئے! اور یہی نہیں کہ صرف غیر ہی ان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ مسلمان خود بھی وحدتِ ملّت کے تصور کو پس پشت پھینک کر اپنے اپنے سیاسی قبلہ سے وفاداری کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے ہیں ـــــ ایران، عراق اور صحراء میں کون کس کو مار رہا ہے؟ اور کس کے لئے؟ آج کتنے لاکھ بے خانماں جلاوطن مسلمان دنیا کے مختلف ملکوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں ـــــ یا مہاجر کیمپوں میں اپنے بڑوں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝

ـــــ آج اگر ملّت اسلامیہ کی سیاسی وحدت وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ کے مراکز میں بٹ کر رہ گئی ہے ـــــ تو ان کی دینی وحدت بھی چند مخصوص کلامی اختلافات اور فقہی مذاہب کو ہی اساس وحدت سمجھ لینے کی بنا پر فرقوں اور مسالک میں تقسیم ہو گئی ہے۔ اور سب آپس میں دست و گریباں ہیں ـــــ سیاسی معاملات ہوں یا دینی توجیہات ہر جگہ اختلافات "رحماءُ بینھم" سے گزر کر "بغیا بینھم" کے نشانِ خطرہ (DANGER POINT) سے متجاوز ہوتے نظر آتے ہیں۔

ـــــ مسلمان غالباً اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی وحدتِ ملّت کے تصور سے اتنا منحرف اور اس کا اتنا محتاج کبھی بھی نہیں ہوا جتنا آج ہے۔

ملّی وحدت کے لئے اور اتحاد کے لئے ایک مضبوط اساس یا ایک ایسے قوی مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں نہ صرف تمام اجزائے ملّت کو مرکزِ ملّت کی طرف کھینچنے کی زبردست قوت موجود ہو۔ بلکہ جو منتشر اور متفرق کرنے والی تمام قوتوں پر غالب بھی آسکے۔

آج یہ بات کرنا تو کوئی انکشاف نہیں کہ ملّت اسلامیہ کی اساس وطن، نسل و رنگ، زبان یا کسی اور مشترکہ وقتی مفاد پر نہیں ہے۔ ملّت اسلامیہ کی اساس دین اسلام ہے ؎

قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری (اقبالؔ)

مگر خود دین اسلام کی صحیح پہچان اور شناخت اس کے اپنے مرکز کے حوالے سے ہی ہو سکتی ہے اس لئے کہ بقول مولانائے رومؒ ؎

دیں بگیرد بدعتی بدعت شود کفر گیرد کاملے ملّت شود

ـــــ ملّت کی اساس دین اور دین کی اساس کتاب و سنّت ہے۔ کتاب و سنّت میں ہی ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک قبلہ اور ایک اُمّت کا تصوّر موجود اور شامل ہے۔ بلکہ یہی ایمان کا مقصود ہے۔

پھر کتاب و سنّت میں بھی سنّت کی حیثیت کتاب کے اوّلین اور معتبر ترین شارح کی ہے جس کے بغیر فہم قرآن کی کوئی کوشش گمراہی سے اور جس کے بغیر ذاتِ رسولؐ سے عشق و وفاداری کا کوئی ادّعا امکانِ کذب سے محفوظ نہیں ہے۔

ـــــ ان معنوں میں دین کی اصل اساس قرآن کریم ہے ـــــ اور اسی کو وحدتِ ملّتِ اسلامیہ کی صحیح ترین اور مضبوط ترین اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

وحدتِ ملّی کے ساتھ قرآنِ مجید کے اس اساسی اور بنیادی تعلق کی مزید وضاحت خود قرآن کریم کی بعض آیات سے ہوتی ہے۔

① آیہ کریمہ: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور باہم نااتفاقی میں نہ پڑو) میں "حبل اللہ" کی تفسیر مفسّرین نے قرآن، اسلام، عہد اللہ، جماعت، اطاعت اور توحید سے کی ہے۔ تاہم اکثر نے اس سے کتاب اللہ یا قرآن کریم ہی مراد لیا ہے۔

(i) ابن جریر نے کتاب اللہ کے معنوں کی تائید میں پانچ مختلف طرق اور اسناد سے روایت بیان کی ہے۔

(ii) حافظ ابن کثیر نے حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالے سے "حبل اللہ" سے مراد "قرآن مجید" لیا ہے۔ ھو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض ـــــ کالحبل الذی یتمسک بہ خشیۃ السقوط

ـــــ احمد محمد شاکر نے ابن کثیر کی تلخیص میں اس روایت کو سنداً ضعیف مگر معناً صحیح اور ثابت قرار دیا ہے اور شواہد کے طور پر کچھ اور روایات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ازانجملہ مسلم (کتاب فضائل صحابہ) کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے ـــــ انی تارک فیکم ثقلین احدھما کتاب اللہ وھو حبل اللہ من اتبعہ کان علی الھدی ومن ترکہ کان علی ضلالۃ

شیعہ مفسّر طبرسی نے چار مختلف روایات کے ذریعے "حبل اللہ" سے قرآن کریم مراد لئے جانے کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ اپنے مسلک کی بنا پر اس نے "اھل بیت" کو بھی اس میں شمار کر ڈالا ہے۔

——— تفسیر "المنار" میں "حبل اللہ" کی تفسیر قرآن مجید سے کرنے کو قول مختار قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے بھی کہ باقی سب معانی خود بخود اس میں شامل ہیں۔ صاحب المنار مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ———

"فہو (یعنی اللہ) اَوجب علینا ان نجعل اجتماعَنا و وحدتنا بکتابہ۔ علیہ نجتمع وبہ نتحد۔ لا بجنسیات نتبعہا ولا بمذاہب نبتدعہا ولا بمواصفات نصنعہا ولا بسیاسات نخترعہا۔ ثم نہانا (اللہ) من التفرق والانفصام لبعد ھذا الایضاح والاعتصام لما فی التفرق من زوال الوحدۃ" ———

یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ آیت اسلام کے نظریہ وحدتِ ملت کے ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں کو شامل ہے۔ واعتصموا ——— اور ——— لاتفرقوا ———

(۴) اتحاد و وحدتِ ملت کے لئے تالیف بین القلوب نہایت ضروری ہے۔ سورہ آل عمران اور سورہ الانفال میں اللہ تعالیٰ نے اعداء کے دلوں کو باہم جوڑنے کے اس عمل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے

(i) اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا

(ii) هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ

سورہ آل عمران ہی کی اس آیت سے پہلے ایک آیت میں اعتصام باللہ (اللہ کو مضبوط پکڑنا) کو حصول ہدایت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے ——— وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ——— اور آگے اسی اعتصام باللہ کا ہی حکم واعتصموا بحبل اللہ کے الفاظ میں دیا ہے۔

——— پوری ملت میں تالیف بین القلوب یا دل جوڑنے کا یہ کام آج بھی کتاب اللہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

فرقہ وارانہ باتوں سے کسی ایک فرقے میں شاید تالیف بین القلوب کا کام لیا جاسکے۔ اور وہ بھی منفی انداز میں۔ مثبت اور تعمیری انداز میں ملت گیر سطح پر تالیف بین القلوب اللہ کے نام پر اور اسلام کے نام پر ہی ممکن ہے اور ان کا مظہر اصلی قرآن کریم ہی ہے اور قرآن کریم ہی "سبیل اقوم" کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

۴) قرآن کریم کے بارے میں قرآن کریم میں ہی وعدۂ حفاظت الٰہی مذکور ہے۔
إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اساسِ قرآنی پر مبنی وحدت ہی محفوظ اور پائیدار وحدت ہوگی۔ اس لئے کہ اس اتحاد یا وحدت کی بنیاد کسی وقتی مصلحت یا کسی منفی مفاد پر نہیں ہوگی۔

ہم جانتے ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کو بھی اپنی اغراض و ہوائے نفس کے تحت تحریف معنوی کا نشانہ بنایا ہے۔ خدا و جبریل و مصطفیٰ کو دم بخود کر دینے والی تاویلات بھی کی گئی ہیں۔ خود بدلنے کی بجائے قرآن کو بدل دینے والے فقیہانِ حرم بھی موجود ہیں ؎

اے بسا عالم ز قرآں حرف جواست　　　دین حق ہفتاد و دو فرقہ از وست

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے نہ صرف الفاظ و حروف میں کوئی ادنیٰ تغیر واقع نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جس طرح سمجھا اور نافذ کیا اور جس طرح اس پر خود عمل کیا اور دوسروں سے عمل کرایا۔ اس کی تمام تر تفصیلات کا ریکارڈ بھی موجود ہے جو اتباع شہوات پر مبنی تمام آراء و تاویلات کے لئے پڑتال اور احتساب کا کام دیتا ہے۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی لفظاً اور معناً حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔ اس لئے قرآن ہی وحدت ملت کی سب سے محفوظ اور محکم ترین اساس ہے ——— قرآن کو چھوڑ کر کسی اور شے پر ملت استوار کرنے کی کوششوں کا انجام "فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ" ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن اور اصلاحِ معاشرہ

از قلم: مولانا الطاف الرحمٰن بنوی
معلم قرآن اکیڈمی

یہ مقالہ بہی ۱۲- نومبر کی منعقد شدہ مجلس مذاکرہ میں پیش کیا تھا ——— (ادارہ)

انسان کے تمام فطری میلانات اور خواہشات کی اگر ہم کسی جامع عنوان سے تعبیر کرنا چاہیں، تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب جلب منفعت اور دفع مضرت کے ذیل میں سموئے ہوئے ہیں۔ اسکی کسی بھی چھوٹی یا بڑی حرکت کا تحقیقی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یا تو وہ نفع اندوزی کے قبیل کی کوئی تدبیر ہے یا تحفظ کے سلسلے کی کوئی کڑی ہے، یہی فطرت وہ مبنی برحکمت اساس ہے جو ایک طرف تو انسانی معاشرت کی تعمیر و ترقی میں بنیادی کردار کی حامل ہے اور دوسری طرف اس کی شکست و ریخت کے لئے بھی ایک موثر عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ظاہر ہے کہ قدرت نے انسان کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے مگر اس بندگی کی تفصیلی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ایک ایسی معاشرت کے بغیر ممکن ہی نہیں جس میں مخاصمانہ اور معاندانہ کشمکش کی بجائے مخلصانہ اور خیر خواہانہ تناصر و تعاضد کا عنصر غالب ہو، یہی وہ اعلیٰ ترین قرآنی معاشرت ہے جو انسانی قابلیتوں کو فعلیت کی سطح پر نمودار ہونے اور زندہ کمالات بننے کا موقعہ بہم پہنچاتی ہے۔

ایسی معاشرت برپا کرنے کے لئے قرآن اولاً تو وہ ایسی حقیقتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جن کا گہرا احساس انسان کی عاملانہ قوتوں یعنی عقل اور جذبات کو آخری حد تک متاثر کرتا ہے جس سے مخاصمت کے مقابلے میں مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ دو حقیقتیں وحدتِ خالق اور وحدتِ ابوین ہیں، قرآن کس

صراحت کے ساتھ اعلان کرتا ہے "

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی" اے لوگو ہم نے تم کو ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا -

ان دو حقیقتوں میں سے اوّل الذکر کسی کے لئے جذباتی سہی، مگر عام لوگوں کے لئے سراسر عقلی محرک ہے جبکہ ثانی الذکر ایک خالص جذباتی داعیہ ہے، یہ دونوں تصورات شخص کو نوع میں ضم ہوجانے پر آمادہ کرتے ہیں اور ایثار و قربانی کی اعلیٰ روایات قائم کرنے پر اکساتے ہیں -

پھر قرآن حکیم نے ان دو حقیقتوں کی روشنی میں خدا اور بندے اور بندے اور بندے کے درمیان تعلق کی نوعیت کو واضح فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ عبودیت اور بندے کے ساتھ اخوت کا رشتہ رکھتا ہے اور پھر ان دونوں رشتوں کی پوری پوری نگہداشت کو ترغیب و ترہیب اور تشویق و تخویف کے مختلف اسالیب کے ذریعہ اس پر لازم اور ضروری قرار دیا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے -

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ ۝

اب ان کلیات کے وہ تمام جزئیات جمع کرکے دیکھیں جو قرآن و حدیث میں بسط و تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں مثلاً اوامر میں اخلاص، امانت، صداقت، عفت، عدل، حیا، ترحم، خیرخواہی اور انکساری وغیرہ اور نواہی کے ضمن میں ریا، خیانت، جھوٹ، فحاشی، ظلم، بے شرمی، قساوت، تن پروری، حسد اور تکبر وغیرہ، تو معلوم ہوگا کہ ان ستونوں پر تمام معاشرے میں انسانی منفعت و مضرت کے نقشے کچھ اس انداز سے ترتیب پاتے ہیں کہ افراد انسانی کی متعارض جبلتوں کے باوجود ان کے مقاصد اور مساعی میں کسی ٹکراؤ اور تناقض کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہتا، چنانچہ خلوت میں رضائے الٰہی کی فکر اور جلوت میں باہمی اخوت کے جذبے سے میل جول، مفاہمت کی ایسی فضا پیدا کردیتے ہیں جس میں معاشرت کی تمام کلیں مجتمع ہوکر ایک ایسی وحدت میں منضم ہوجاتی ہیں جو ایک ہی ارادے اور ایک ہی قوتِ عمل کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی بھی فرد قرآن کی متعینہ ڈگر سے ہٹ کر کسی اور راستے

پرچل نکلتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوگا تو قرآن حکیم ایک طرف تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ اور وَاِنْ طَائِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ اور انہی آیات کی شرح میں نبی علیہ السلام من رأی منکم منکرًا فلیغیّرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ اور انصر اخاک ظالمًا او مظلومًا جیسے حکیمانہ احکام سے بقیہ افرادِ معاشرہ کو اس کا سدِباب کرنے پر آمادہ کرتا ہے - اور دوسری طرف وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ جیسی وعیدات سے قیامت کی بازپرس کا خوف دلاتا ہے یہ دونوں چیزیں اثر کئے بغیر نہیں رہتیں چنانچہ جلد ہی مادۂ فساد کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں -

انہی قرآنی خطوط پر تشکیل پایا ہوا معاشرہ تخلیقِ انسانی کی وہ غایت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اس طرح سے ذکر فرمایا۔ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ٥ اور اس کے بغیر کسی بھی ڈھنگ پر کوئی بھی معاشرہ وجود میں آئیگا تو اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ٥ کا نقشہ پیش کرے گا -

قرآن نے ایک اعلیٰ معیاری معاشرت کا ایک نظریہ ہی نہیں دیا بلکہ اس کے حاملین نے یہ معاشرہ قائم کرکے دکھایا اور معاشرتی مساوات کے وہ وہ نمونے پیش کئے جس پر اسلامی تاریخ کو بجا طور پر فخر حاصل ہے امیرالمؤمنین عمر فاروق رضؓ جیسے باجبروت حکمران اپنے ایک غلام کی معیت میں بیت المقدس کا سفر کرتے ہیں چنانچہ ایک ہی اونٹنی پر باری باری سے سوار ہو کر یہ لمبی مسافت طے کرتے ہیں عین اس وقت جبکہ بیت المقدس میں داخل ہوتے ہیں غلام کی سواری کا نمبر ہے وہ عرض کرتا ہے امیرالمؤمنین! آپ اتریں نہیں میری نوبت میں بھی سوار رہیں اور مجھے اونٹ کی مہار پکڑے رہنے دیں تاکہ داخلے کے وقت آقا اور غلام ایک دوسرے سے ممتاز ہوں آپ فرماتے ہیں "الدود دورك

نوا اللہ لا نـزلن دلتی کبتی باری تمہاری ہے خدا کی قسم میں لازماً اترون گا اور تم سوار ہوگے اور یہی امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی ہی ہیں جو ایک کالے بھجنگے حبشی غلام حضرت بلال رضؓ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں "بلال سید ننا" کہ بلال ہمارے سردار ہیں اور فقط فاروق اعظم رضؓ ہی پر کیا انحصار اسلامی اور قرآنی معاشرت کے پورے خدوخال اور اس کے برکات و ثمرات دیکھنے ہوں تو بتیس سالہ طویل مدت پر پھیلے ہوئے خلافت راشدہ کے اس دور کو ملاحظہ کیجیے جس کو بجا طور پر تاریخ انسانی کا سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے۔

ایک صالح معاشرت کے بغیر خلافت ارضی کی گراں بار اجتماعی ذمہ داریوں سے نبٹنا نہ صرف مشکل بلکہ قطعاً انہونی بات ہے اپنے فرائض منصبی کی کما حقہٗ ادائیگی کے لئے انسانیت کو قرآن کی معاشرتی ہدایات و تعلیمات پر توجہ مرتکز کرنی ہوگی اس کے بغیر صلاح اور صلاح کے بغیر فلاح کی توقع بڑی حماقت ہے۔

OOOOOOO

بقیہ: "قرآنِ حکیم اور اصلاحِ معاشرہ"

کے لئے موزوں افراد بھی متعین کئے جائیں۔ کیونکہ افراد کا موزوں ہونا انتہائی ضروری ہے کسی بھی نظام کے چلانے والے افراد ہی ہوتے ہیں۔ اگر افراد موزوں نہیں ہوں گے تو کوئی بھی نظام صحیح طور پر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ جو فرد اسلامی نظام میں کسی بھی منصب پر مقرر ہو وہ فکری طور پر اس نظام کی حقانیت پر یقین رکھتا ہو اور اس کو قابل عمل ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اصلاح کے لئے سود مند بھی سمجھتا ہو۔ کسی بھی کمیونسٹ ملک میں آپ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کسی ایسے شخص کو کوئی بھی منصب سونپا جائے جو کہ کمیونزم پر یقین نہ رکھتا ہو۔

مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام

از قلم: مولانا محمد طاسین

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ امابعد فقد قال اللّٰہ تعالیٰ فی کتابہ المبین:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ: "اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ وہ تجارت کا طریقہ اور باہمی رضامندی سے ہو۔"

موضوع اور مقصد جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مقالے کا موضوع ہے: "مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام" اور مقصد یہ واضح و متعین کرنا ہے کہ اسلام کی رو سے یہ نظام جائز و درست ہے یا ناجائز و نادرست؛ اور اگر یہ ناجائز و نادرست ہے تو پھر از روئے اسلام نظامِ زمینداری کی جائز اور صحیح شکل کیا ہے۔

مروّجہ نظامِ زمینداری غلط مبحث سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ شروع میں یہ واضح کر دیا جائے کہ مروّجہ نظامِ زمینداری سے میری مراد کیا ہے؟ اس سے میری مراد وہ نظامِ زمینداری ہے جس کے اندر زراعت اور زرعی معیشت سے تعلق رکھنے والے لوگ دو مختلف طبقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ مالکانِ زمین اور زمینداروں کا کہلاتا ہے۔

اور دوسرا مزارعین اور کاشتکاروں کا طبقہ، اوّل الذکر طبقہ کو کسی نہ کسی جائز و ناجائز طریقہ سے زرعی زمینوں سے متعلق حقِ ملکیت تو حاصل ہوتا ہے لیکن وہ اپنی مملوکہ زمینوں کو خود کاشت نہیں کر رہا ہوتا بلکہ دوسروں سے بٹائی و مزارعت یعنی پیداوارِ زمین کے ایک حصّہ پر کاشت کرا رہا ہوتا ہے یا پیداوار کے ایک حصّہ کی بجائے کاشت کار سے بطور کرایہ نقد رقم وصول کرتا ہے ۔۔۔ ثانی الذکر طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی زیرِ کاشت اراضی کے مالک تو نہیں ہوتے لیکن زراعت و کاشت کاری کی جملہ مشقتیں و صعوبتیں وہی برداشت کرتے اور اس کے عوض پیداوار کا ایک حصّہ پاتے ہیں، دوسرا فرق ان دو طبقوں کے درمیان یہ ہے کہ پہلے طبقہ کے لوگوں کو عموماً دوسرے طبقہ کے لوگوں پر معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی فوقیت و برتری حاصل ہوتی اور دوسرے طبقہ کے لوگ عموماً معاشی لحاظ سے پسماندہ، خستہ حال اور معاشرتی اعتبار سے بے وقعت اور سیاسی طور پر محکوم ہوتے ہیں۔ گویا پہلے طبقہ کی حیثیت آقا اور دوسرے کی غلام کی سی ہوتی ہے۔

مروّجہ نظامِ زمینداری کی دو بنیادیں مروّجہ زمینداری نظام کی جو وضاحت پیش کی گئی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظام کی پوری عمارت دو بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت اور دوم معاملۂ مزارعت پر جسے اردو میں بٹائی کا معاملہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جاننے کے لئے کہ مروّجہ نظامِ زمینداری اسلام کی رُو سے جائز و صحیح ہے یا ناجائز و باطل؟ یہ جاننا ضروری ہوگا کہ زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت اور معاملۂ زراعت، اسلام کی رُو سے جائز ہیں یا ناجائز؟ چنانچہ اگر تحقیق سے یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں از روئے اسلام جائز ہیں تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوگا کہ یہ نظامِ زمینداری جائز ہے، اور اگر محکم دلائل سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دونوں یا دونوں میں سے ایک اسلام کے نزدیک جائز نہیں تو یہ مروّجہ نظامِ زمینداری خود بخود ناجائز قرار پائے گا۔

بنا بریں عقلی طور پر بحث و تحقیق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان دو مسئلوں پر الگ الگ بحث کی جائے اور دلائل کی روشنی میں یہ پتہ چلایا جائے کہ زمین کی

شخصی ملکیت اور معاملۂ مزارعت قرآن وحدیث کی رُو سے جائز ہیں یا ناجائز؟ لیکن چونکہ معاملۂ مزارعت کا دار و مدار زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت پر ہے اگر زمین کی شخصی ملکیت نہ ہو تو معاملۂ مزارعت کا وجود ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ معاملہ جن دو فریقوں کے درمیان طے پاتا ہے ان میں ایک مالکِ زمین اور دوسرا کاشت کار ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت کا وجود مقدم اور معاملۂ مزارعت کا وجود مؤخر ہے۔ لہٰذا تقاضائے عقل یہ ہے کہ مسئلۂ ملکیتِ زمین پر پہلے اور مسئلۂ مزارعت پر بعد میں بحث کی جائے تو لیجئے بحث کا آغاز مسئلۂ ملکیت زمین سے کیا جاتا ہے۔

مسئلۂ ملکیتِ زمین اور اسلام

زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت کا اگر یہ مطلب لیا جائے کہ کسی خاص قطعہ زمین سے انتفاع و استفادے کے حق میں کسی شخص و فرد کو دوسرے اشخاص و افراد پر ترجیح و تخصیص حاصل ہونا ایسی کہ اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر دوسرا کوئی اس قطعۂ زمین سے استفادہ و انتفاع اور اس میں کوئی ایسا تصرف نہ کر سکے جو مالک کے لئے مخصوص ہوتا ہے تو اس مطلب کے لحاظ سے بلاشبہ اسلام زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا اور اسے جائز ٹھہراتا ہے، اس کا ثبوت قرآن وحدیث کی ان جزوی نصوص سے بھی فراہم ہوتا ہے جو خاص طور پر زمین کی شخصی ملکیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس اصولی و کلی تصور سے بھی مہیا ہوتا ہے جو عام اشیاء کی انفرادی و شخصی ملکیت سے متعلق قرآن وحدیث کے اندر پایا جاتا ہے۔

پھر چونکہ زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت سے متعلق قرآن و حدیث میں جو جزوی نصوص ہیں غور سے دیکھا جائے تو وہ بھی دراصل ملکیت کے اصولی و کلی تصور کی جزئیات و فروع نظر آتی ہیں جو عام اشیاء کے متعلق قرآن وحدیث میں ہے۔ لہٰذا زیادہ بہتر اور مفید ہوگا کہ پہلے قرآن و

حدیث میں مذکور ملکیت کے اصولی و کلی تصوّر کو واضح کیا جائے اور پھر ان جزوی نصوص کو سامنے لایا جائے جو خاص طور پر ملکیتِ زمین سے متعلق ہیں۔

انسانی ملکیت کا اُصولی تصوّر ملکیت کے مسئلہ سے متعلق جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے جو بات روشن ہو کر سامنے آتی ہے اور جو حقیقت اجاگر ہوتی ہے وہ یہ کہ کائنات کی ہر ہر شے کا حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے جس نے کائنات کی ہر ہر شے کو پیدا کیا اور جو ہر ہر شے کی پرورش و تربیت کر رہا اور ہر شے کے لئے وہ سب سر و سامان مہیا فرماتا ہے جو اس شے کی حیات و بقاء کے نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔ گویا ہر شے کے خالق اور رب ہونے کی وجہ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی ہر شے کا جس میں انسان بھی شامل ہے حقیقی مالک ہے اور اسے ہر شے کے اندر ہر قسم کے تصرّف و ردّ و بدل کا کامل، ذاتی اور مستقل حق و اختیار حاصل ہے۔

ہر شے کا حقیقی مالک صرف اللہ ہے قرآن مجید کی جن آیات سے اس حقیقت کا انکشاف اور اس بات کا اظہار ہوتا ہے ان میں ایک تو اس مضمون کی آیات ہیں :-

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ	"اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے"

اس قسم کی آیات قرآن مجید میں بیس سے زائد جگہ ہیں اور یہ اپنی نحوی ترکیب کے لحاظ سے اس پر دلالت کرتی ہیں کہ کائنات کی ہر شے کی ملکیت صرف اللہ تعالےٰ کے لئے مخصوص ہے اور تنہا وہی ہر شے کا حقیقی مالک ہے اور یہ اس لئے کہ اس کے سوا کوئی نہ کسی شے کا خالق ہے اور نہ رب کیونکہ قرآن مجید کی متعدد آیات بتلاتی ہیں کہ ہر شے کا خالق اور رب صرف اللہ ہے اور یہ کہ صفتِ خالقیت و ربوبیت میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں جو صفتِ مالکیت کی بنیاد ہے۔ لہٰذا صفتِ مالکیت میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں، اس لحاظ سے انسان نہ صرف یہ کہ کسی شے کا حقیقی مالک نہیں بلکہ دوسری تمام اشیاء کی طرح وہ خود بھی اللہ کا

مملوک ہے ۔ اور یہ اس لئے کہ انسان کسی شے کا خالق نہیں اور وہ کسی شے کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتا۔ کسی بڑی شے کو تو کیا وہ ایک ذرّے تک کو نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ فنا کر سکتا ہے۔ ایک انسان عمر بھر جو کرتا ہے اور کر سکتا ہے وہ صرف یہ کہ تحلیل و ترکیب کے عمل سے اشیاء کی شکلوں صورتوں میں ردو بدل اور تغیّر و تبدّل کرتا ہے۔ لہٰذا اگر ایک انسان کے عمل سے عالم موجودات میں کسی نئی چیز کا اضافہ ہوتا ہے تو صرف ان تغیّرات و تبدّلات کا ہوتا ہے جو انسان کی دماغی جسمانی سعی و حرکت اور محنت و مشقّت سے وجود میں آتے اور مختلف شکلوں میں مادی اشیاء کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بظاہر کا لفظ میں نے اس لئے کہا کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ تغیّرات و تبدّلات بھی اللہ ہی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا خالق بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ بے شمار اسباب و عوامل جن پر انسانی سعی و عمل کا دارومدار ہے اللہ ہی کے پیدا کردہ اور اسی کے تصرّف و اختیار میں ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، روشنی، حرارت اور غذائی اشیاء، اگر ان میں سے ایک چیز بھی موجود نہ ہو تو انسانی سعی و عمل تو درکنار، انسان سرے سے زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور ظاہر ہے کہ سب چیزیں اللہ ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ اور پھر وہ دماغی و جسمانی صلاحیتیں اور قوتیں بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کی خلق کردہ ہیں جن کے ذریعے انسان سعی و عمل کرتا اور مادی اشیاء میں تغیّرات و تبدّلات کا باعث بنتا ہے، قرآن حکیم کی بعض آیات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انسان کی طرح اس کے اعمال و افعال کا بھی خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت ہے:

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ — "اور اللہ ہی خالق ہے تمہارا اور تمہارے اعمال کا جو تم کرتے ہو"

اسی طرح سورۃ الزمر میں ہے:—

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ — "اللہ ہر شے کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے۔"

اِنسان کسی چیز کا خالق نہیں لہٰذا حقیقی مالک بھی نہیں | چونکہ انسان، اس کا عمل و کام اور اس کے عمل و کام

سے ظہور میں آنے والے تغیرات و تبدلات بھی شے کا مصداق ہیں لہٰذا اس دوسری آیت کے مصداق ان کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوتے اور وجود میں آتے ہیں۔

غرضیکہ حقیقت میں کوئی انسان کسی شے کا خالق نہیں لہٰذا کوئی انسان کسی شے کا حقیقی مالک بھی نہیں۔ خالق اور ہر شے کا حقیقی مالک فقط اللہ تعالیٰ ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جو صفاتِ مقدسہ اور اسماءِ حسنیٰ بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک صفت مالکیت اور ایک اسم مالک ہے، سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کے جن اسماءِ صفات کا ذکر ہے ان میں ایک مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ پھر سورۂ آل عمران کی اس آیت میں صراحت کے ساتھ اللہ کے اس اہم صفت کا ذکر ہے۔

اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي	"اے اللہ بادشاہت کے مالک،
الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ	تو جسے چاہتا بادشاہت دیتا اور جس
تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ	سے چاہتا بادشاہت چھین لیتا ہے"

اللہ کی صفتِ مالکیت پر ایمان کا مطلب بنا بریں اللہ پر ایمان لانے کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے صفات پر ایمان کے ساتھ ساتھ اس کی صفتِ مالکیت پر بھی ایمان ہو۔ چنانچہ وہ شخص کبھی مومن نہیں ہو سکتا جو اللہ کی صفتِ مالکیت کو دل سے نہ مانتا اور زبان سے اس کا اقرار نہ کرتا ہو۔ اس صفتِ الٰہیہ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے دل میں یہ اعتقاد ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی ہر ہر شے میں ہر قسم کے تصرف و ردّ و بدل کا کامل، کلی، ذاتی اور دائمی اختیار ہے اور اس کا ہر تصرف درست اور مفید ہے۔ کسی کو اس کے کسی تصرف پر اعتراض و شکایت کا کوئی حق نہیں، اللہ کی صفت مالکیت پر اعتقاد کا تقاضا یہ ہے کہ بندۂ مومن ہر اس تصرف کو صحیح سمجھے اور اس پر راضی و خوش رہے جو اس کی ذات و زندگی میں واقع ہو یا عالمِ انسانیت اور کائنات کی کسی دوسری چیز میں، اسی طرح اس اعتقاد کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بندہ یہ سمجھے کہ وہ اپنے اعمال و تصرف میں آزاد و خود مختار نہیں بلکہ مالکِ

حقیقی اللہ تعالیٰ کی مرضی کا پابند ہے اسے اپنی ذات یا دنیا کی کسی اور شے کے اندر کوئی ایسا تصرف نہیں کرنا چاہیئے جو اللہ کی مرضی و منشا اور اس کے احکام و قوانین کے مخالف و منافی ہو۔

کائنات کی ہر شے نوعِ انسان کے فائدہ کے لئے ہے | انسانی ملکیت کی توضیح و تشریح کے

سلسلہ میں قرآن حکیم کے مطالعہ سے جو دوسری بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کائنات کی ہر شے کا حقیقی مالک ہے کائنات کی ہر شے کو بنی نوع انسان کے استفادے کے لئے مباح عام کر دیا ہے۔ اس کا اظہار قرآن حکیم کی جن آیات سے ہوتا ہے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۝ (بقرہ)	"وہ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے فائدے اور انتفاع کے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا اور خلق فرمایا۔"
وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝ (بقرہ)	"اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک"
اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (بقرہ)	"وہ رب جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے پھل غلّے اگائے بطور رزق تمہارے لئے"
وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ (الاعراف)	"اور بے شک ہم نے تمہیں زمین میں قدرت و اختیار کے ساتھ بسایا اور متمکن کیا اور آسیں تمہارے لئے سامان معاش رکھا"
وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (النازعات)	"اور اس کے بعد زمین کو ہموار کر کے بچھایا۔ اس میں سے پانی نکالا اور چارہ اگایا اور پہاڑوں کو مضبوطی کے ساتھ جمایا۔ تمہارے فائدہ کے لئے اور تمہارے

مویشیوں کے فائدہ کے لئے "

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ

(عبس)

"ہم نے خوب پانی برسایا۔ پھر زمین کو خاص طرح سے پھاڑا۔ پھر اس میں اگائے غلے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور اور گھنے باغ اور پھل میوے اور چارہ، تمہارے فائدے کے لئے اور مویشیوں کے فائدہ کے لئے۔"

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ

(الانعام)

"اور چوپائے مویشی اللہ نے تمہارے فائدے کے لئے پیدا فرمائے۔ ان میں گرمی کا سامان اور دوسرے بہت سے منافع ہیں اور بعض ان میں وہ ہیں جن کا گوشت تم کھاتے ہو"

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ

"حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے فائدہ کی خاطر"

قدرتی اشیاء سے حق استفادہ میں مساوات

اوپر مذکور چند آیات بطور مثال ہیں ورنہ قرآن مجید کے اندر بکثرت ایسی آیات ہیں جن میں مظاہر فطرت، زمین آسمان، چاند سورج، پہاڑ دریا، جمادات و نباتات اور حیوانات وغیرہ کا اس طرح ذکر ہے کہ یہ سب اشیاء اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے تمتع و انتفاع کے لئے پیدا کی ہیں اور انسان کو ایسی علمی و عملی اور دماغی و جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ وہ ان تمام اشیاء سے فائدہ اٹھا اور خدمت لے سکتا ہے اور چونکہ ان آیات کا تعلق نوع انسان سے ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کائنات کی تمام اشیاء کا حقیقی مالک ہے اپنی مملوکہ اشیاء سے نوع انسان کے سب افراد کو متمتع و منتفع ہونے کا حق و اختیار دیا ہے۔ اور چونکہ یہ حق و اختیار محض انسان ہونے کی حیثیت سے دیا گیا ہے لہٰذا اس میں سب

انسان اور نوع انسان کے تمام افراد برابر کے شریک ہیں۔ رنگ، زبان، وطن، قوم قبیلے، دین و مذہب کی بنیاد پر کسی انسان کو دوسرے انسان پر کوئی ترجیح و فوقیت نہیں بلکہ سب اس حق میں برابر و مساوی ہیں اور سب کو اللہ کی پیدا کردہ قدرتی اشیاء سے انتفاع و استفادے کا یکساں حق ہے اور یہ اس لئے بھی کہ ہر انسان اپنی حیات و بقا کی خاطر جبلّی و فطری طور پر ان قدرتی اشیاء سے انتفاع و استفادے کا محتاج بھی ہے۔ لہٰذا یہ بلا کسی تخصیص و امتیاز اور بلا کسی تفریق و استثناء ہر انسان کا انسانی اور فطری حق ہے جو رب العلمین نے اپنی عمومی رحمت کے تحت ہر انسان کو عطا فرمایا ہے۔

انسان کی سعی کے ثمرات اسی کے لئے ہیں

مسئلۂ ملکیت کے سلسلہ میں تیسری اصولی بات جو قرآن و حدیث کے مطالعہ سے ہمارے علم میں آتی ہے وہ یہ کہ ہر انسان کی تعمیری سعی و جہد کے مفید اثرات و نتائج، خود اس انسان کے لئے ہیں اور وہی ان سے فائدہ اٹھانے کا مستحق و حقدار ہے دوسرا کوئی اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر ان سے فائدہ اٹھانے کا مجاز نہیں، اس اصولی تصوّر کا اظہار قرآن مجید کی جن آیات سے ہوتا ہے ان میں سے ایک سورہ البقرہ کی یہ آیت ہے:۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۝ — "ہر نفس کے مفید کام کا فائدہ بھی اسی کیلئے اور مضر کام کا ضرر بھی اسی پر"

یعنی جو متنفّس اچھا کام کرتا ہے اس کا فائدہ بھی اسی کے لئے اور جو برا کام کرتا ہے اس کا ضرر بھی اسی پر عائد ہوتا ہے۔ دوسری آیت سورۂ فُصِّلَتْ اور سورۂ الجاثیہ کی یہ آیت ہے:۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ — "جس نے نیک و اچھا عمل کیا اس کا فائدہ بھی اسی کے لئے اور جس نے بد اور برا کام و عمل کیا اس کا ضرر اور وبال بھی اسی پر"

تیسری آیت سورہ وَالنَّجم کی یہ آیت ہے جو اس بارے میں نص صریح اور محکم کی حیثیت رکھتی ہے

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝	"اور یہ کہ نہیں ہے انسان کے فائدہ کے لئے مگر وہ جو اس کی سعی سے پیدا ہوا"

اس آیت مبارکہ میں جو تعلیم و ہدایت فرمائی گئی ہے وہ یہ کہ ہر انسان کی مفید سعی و کوشش اور جد و جہد کا فائدہ اور ثمرہ خود اس کے لئے مخصوص ہے کیونکہ اس آیت میں لَیْسَ حرف نفی اور اِلَّا حرف استثناء سے مضمون میں حصر پیدا ہوگیا ہے۔ لہٰذا مفہوم یہ ہوا کہ جس انسان کی سعی و جہد سے جو مفید اثرات وجود میں آئیں وہ "اس کے لئے مخصوص ہیں اور وہی ان سے فائدہ اٹھانے کا اصل حقدار ہے دوسرا کوئی حقدار نہیں، یعنی وہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور فائدہ اٹھانے کے لئے ان میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

ایسی قرآنی آیات کا تعلق انسان کی دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں سے ہے

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس قسم کی قرآنی آیات کا مفہوم و مطلب بڑا وسیع اور جامع ہے جو انسان کی دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں سے یکساں تعلق رکھتا ہے اور دونوں کی صلاح و فلاح کا حامل اور ضامن ہے، اسے صرف اخروی یا صرف دنیوی زندگی سے مخصوص و محدود کر دینا درست نہیں کیونکہ قرآنی ہدایات کا مقصد انسان کی اخروی فوز و فلاح بھی ہے اور دنیوی صلاح و بھلائی بھی، یہ دوسری بات ہے کہ قرآن مجید انسان کی اخروی فلاح و کامیابی کو اصل فلاح و کامیابی ٹھہراتا ہے اور اسے بنیادی اہمیت دیتا ہے، لہٰذا مذکورہ قرآنی آیات کا مطلب یہ بنتا ہے کہ ہر انسان کے اچھے کسب و عمل اور تعمیری سعی و کوشش پر دنیا میں جو اچھے اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ بھی اسی کے لئے اور جو آخرت میں مرتب ہوں گے وہ بھی اسی کے لئے مخصوص ہیں۔ گویا اچھے عمل پر اچھی جزاء خواہ وہ دنیا میں ظاہر ہو یا آخرت میں، عمل کرنے

والے کے لئے مخصوص ہے اور وہی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔

اختیاری اعمال و مساعی کا اصل محرک

مزید غور سے دیکھا جائے تو یہ تعلیم انسانی فطرت کے عین مطابق اور عقل و قیاس کی رُو سے ایک بالکل صحیح اور حق تعلیم ہے کیونکہ انسان کی یہ اٹل فطرت ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی کہ وہ اپنے شعور و ارادہ اور اختیار و مرضی سے جو بھی سعی و جہد اور کام و عمل کرتا ہے صرف اس وقت کرتا ہے جب اسے یہ یقین یا غالب ظن ہوتا ہے کہ اسے اس سے کوئی مادی یا روحانی، دنیوی یا اُخروی فائدہ پہنچے گا اور اس کی اس سے کوئی جسمانی یا روحانی اور دنیوی و اُخروی حاجت و ضرورت پوری ہوگی اور سکون و اطمینان میں اضافہ ہوگا، گویا ذاتی فائدے کا شعور ہی وہ اصل محرک ہے جو انسان کو کسی اختیاری اور ارادی کام و عمل اور جد و جہد پر ابھارتا اور آمادہ کرتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو انسان بظاہر دوسروں کے فائدہ کے لئے جو سعی و عمل کرتا ہے اس کی تہہ میں بھی یہی شعور کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کو کوئی فائدہ پہنچے گا مثلاً اللہ کی رضا و خوشنودی اور آخرت کی نجات و سعادت حاصل ہوگی، یا دنیا میں اسے اچھی شہرت اور نیک نامی نصیب ہوگی اور لوگ اس کی عزت کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ایک انسان جو بھی دماغی و جسمانی سعی و محنت اور کام کاج کرتا ہے اس میں ضرور اس کی انرجی و توانائی صرف ہوتی ہے اور اسے ضرور زحمت و تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا عقل اور عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس انسان کی دماغی و جسمانی سعی و محنت اور جد و جہد سے جو مفید اثرات وجود میں آئیں وہ اس کے لئے مخصوص ہوں اور وہی ان سے فائدہ اٹھانے کا حق دار ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قرآن حکیم کی مذکورہ تعلیم فطری اور معقول بھی ہے اور عدل و انصاف کے عین مطابق بھی ——!!

ہر انسان کے لئے اس کی سعی کے اثرات محفوظ ہونے کی عملی صورت

پھر چونکہ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسانی سعی و محنت اور کام و عمل کے ذریعے جو مفید اثرات وجود میں آتے ہیں خارج میں ان کا الگ تھلگ مستقل وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ مختلف تغیرات

وتبدّلات کی شکلوں میں مختلف مادی اشیاء کے ساتھ قائم و وابستہ ہوتے ہیں مثلاً ایک کسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات کھیت کے ساتھ قائم و وابستہ ہوتے اور کھیتی، غلّوں اور پھلوں وغیرہ کی شکل میں سامنے آتے ہیں، ایک معمار کی محنت و مشقت کے مفید اثرات اینٹ، پتھر سیمنٹ وغیرہ تعمیری مواد کے ساتھ قائم ہوتے اور مکان کی شکل میں ہویدا ہوتے ہیں، ایک بڑھئی کی سعی و محنت کے مفید اثرات لکڑی کے ساتھ قائم ہوتے اور میز کرسی وغیرہ کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں، اسی طرح ایک لوہار کی سعی و محنت کے مفید اثرات لوہے کے ساتھ وابستہ ہو کر مختلف آلات واوزار اور ساز وسامان کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں، غرضیکہ ہر صانع، کاریگر اور محنت کش کی سعی و جہد اور محنت و مشقت کے مفید اثرات، قدرتی اشیاء میں سے کسی نہ کسی شے کے ساتھ وابستہ و قائم ہو کر مختلف مصنوعات کی شکل میں سامنے آتے ہیں، ان قدرتی اشیاء سے ہٹ کر ان کا الگ اور مستقل کوئی وجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر انسان کے لئے اس کی سعی و محنت کے مفید اثرات، مخصوص اور محفوظ ہونے کی عملی اور خارجی طور پر جو صورت ہو سکتی ہے وہ یہ کہ ہر انسان کے لئے وہ قدرتی شے مخصوص اور محفوظ ہو جس کے ساتھ اس کی سعی و محنت کے مفید اثرات قائم و وابستہ ہو چکے ہیں، اور اب دوسرا کوئی شخص اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس شے سے انتفاع و استفادہ نہ کر سکے۔

بنا بریں قرآن مجید کی جن آیات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر انسان کی سعی و محنت کے مفید اثرات و نتائج خود اسی کے لئے ہیں۔ ان آیات سے بطور اقتضاء النص یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس قدرتی شے کے ساتھ جس شخص کی سعی و محنت کے مفید اثرات قائم ہوں وہ شے اس شخص کے لئے مخصوص اور محفوظ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان آیات کا عملی طور پر کوئی مطلب بنتا ہی نہیں۔

شخصی ملکیت کا اصل سبب اور پھر ادھر چونکہ کسی شے کے متعلق کسی شخص کی ملکیت کا مفہوم و مطلب بھی یہی ہے کہ اس شے سے انتفاع و استفادے کے حق میں اس شخص کو دوسروں کے مقابلہ میں ترجیح و تخصیص حاصل ہے لہٰذا مذکورہ آیات سے جہاں شخصی ملکیت کا ثبوت فراہم

ہوتا ہے وہاں اس کا سبب اور فلسفہ بھی سمجھ میں آتا ہے یعنی یہ کہ قرآن مجید کے نزدیک شخصی ملکیت کا اصل سبب اور حقیقی فلسفہ وہ مفید اثرات ہیں جو کسی شخص کی سعی و محنت سے وجود میں آتے اور کسی قدرتی شے کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں، اور پھر اس سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ کسی شے کے متعلق کسی شخص کی ملکیت اسوقت تک موجود رہتی ہے جب تک اس شے کے ساتھ اس کی محنت کے اثرات قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی طرح سے وہ اثرات زائل و ختم ہو جائیں تو یہ شخصی ملکیت بھی زائل اور ختم ہو جاتی ہے اور وہ شے اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے اور اس سے انتفاع کا حق سب انسانوں کے لئے عام اور یکساں ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر ایک شخص جنگل جاتا اور وہاں سے کوئی جانور پکڑ کر آبادی میں لے آتا ہے تو جنگل جانے آنے اور جانور پکڑ کر آبادی میں لانے کے سلسلہ میں اس نے جو سعی و محنت کی اور جو زحمت و تکلیف اٹھائی اس کی وجہ سے یہ جانور اس کی شخصی ملکیت بن کر اس کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر کبھی وہ جانور خود بھاگ کر جنگل چلا جاتا یا یہ شخص خود اس کو جنگل میں چھوڑ دیتا ہے تو اس جانور کے متعلق اس کی شخصی ملکیت زائل ہو جاتی ہے۔ اور وہ جانور مباح عام کی سابقہ حیثیت اختیار کر لیتا ہے، یا مثلاً ایک شخص دریا سے مچھلی پکڑنے کے بعد پھر اس مچھلی کو دریا میں ڈال دیتا ہے تو اس مچھلی کے متعلق اس کی ملکیت وجود میں آنے کے بعد زائل ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً ایک کمہار مٹی سے برتن بنانے کے بعد توڑ پھوڑ کر پھینک دیتا ہے تو اسے برتن کے متعلق جو ملکیت حاصل ہوئی تھی وہ زائل و ختم ہو جاتی ہے۔

دو آدمیوں کی مستقل ملکیت ایک شے میں جمع نہیں ہو سکتی—!!

شخصی ملکیت کے اس تصور کے مطابق ایک شخص کو کسی شے سے استفادہ و انتفاع کے حق میں جو ترجیح و تخصیص حاصل ہوتی ہے چونکہ وہ دوسرے اشخاص و افراد کے مقابلہ میں ہوتی ہے جو اس کی طرح انتفاع و استفادے کے محتاج و ضرورت مند ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایک ہی شے میں بیک وقت دو اشخاص کی مستقل ملکیت جمع نہیں ہو سکتی اور دو شخص ایک ہی شے کے دو مستقل اور الگ الگ مالک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انتفاع و استفادے

میں ایک کی تخصیص سے دوسرے کی تخصیص کی نفی ہو جاتی اور عملاً ان دونوں کے مابین ضرور تصادم اور نزاع واقع ہوتا ہے۔

اللہ کی ملکیت اور انسان کی ملکیت ایک جگہ جمع ہو سکتی ہے

لیکن ایک ہی شے میں بیک وقت اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور انسان کی ملکیت دونوں جمع ہو سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انتفاع و استفادے کا محتاج نہیں اور اس کی ملکیت کا وہ مفہوم و مطلب نہیں جو ایک انسان کی ملکیت کا ہے، اللہ تعالیٰ کی ملکیت کا مفہوم و مطلب ہے اللہ تعالیٰ کو بحیثیت خالق اور رب کے ہر شے کے اندر ہر قسم کے تصرف اور ردّ و بدل کا کُلّی، ذاتی، مستقل اور حقیقی اختیار ہے۔ وہ جس چیز میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے اور اس کا ہر تصرف صحیح و درست ہوتا ہے جبکہ انسان کو اپنی مملوکہ چیز میں تصرف کا جو اختیار ہوتا ہے وہ کلی و کامل نہیں بلکہ جزوی اور ناقص، ذاتی نہیں بلکہ وہبی و عطائی، حقیقی نہیں مجازی اور مستقل و دائمی نہیں بلکہ عارضی و وقتی ہوتا ہے اور پھر چونکہ اللہ تعالیٰ جس میں جو بھی تصرف فرماتا ہے وہ بندوں کی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے بھی بندے کے اپنی چیز میں صحیح تصرف اور اللہ کے تصرف میں کوئی تعارض و ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا اور دونوں کی ملکیت بیک وقت یکجا جمع ہو سکتی ہے اور کسی شے کے متعلق اللہ کی ملکیت کے اثبات سے انسان کی ملکیت کی نفی اور انسان کی ملکیت کے اثبات سے اللہ کی ملکیت کی نفی نہیں لازم آتی۔ چنانچہ قرآن مجید کی وہ آیات جو اللہ کی ملکیت پر دلالت کرتی ہیں بالکل صحیح اور وہ آیات جو انسان کی ملکیت پر دلالت کرتی ہیں، قطعاً درست ہیں اور ان کے درمیان کوئی تعارض و تناقض نہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کا طرزِ فکر غلط ہے جو ان قرآنی آیات کے پیشِ نظر جن سے ہر شے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ملکیت کا اظہار ہوتا ہے انسان کی ملکیت کا سرے سے انکار کرتے ہیں حالانکہ اسی قرآن مجید کے اندر بڑی کثیر تعداد میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن سے انسانی ملکیت کا اثبات ہوتا ہے۔

انسانی ملکیت سے متعلق قرآنی آیات

ان آیات سے میری مراد ایک تو وہ آیات ہیں جن میں مال کی اضافت انسانوں

کی طرف ہے جو ان کی ملکیت پر دلالت کرتی ہے۔ ایسی آیات تقریباً ستر ہیں جن میں اَمْوَالَهُمْ، اَمْوَالَكُمْ، مَالُهُ، اَمْوَالُنَا، اَمْوَالُ النَّاسِ، اَمْوَالُ الْيَتَامٰى وغیرہ الفاظ ترکیب اضافی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، جس طرح کتاب زید اور قلم زید کی ترکیب اضافی کتاب اور قلم کے متعلق زید کی ملکیت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح مذکورہ الفاظ میں اموال کی اضافت انسانوں کی طرف ان کی ملکیت پر دلالت کرتی ہے۔ دوسری وہ آیات ہیں جن میں زکوٰۃ، صدقات، قرض حسنہ، انفاق فی سبیل اللہ، وصیت و وراثت، مہر و نفقہ، دیت و خونبہا، کفارہ، بیع و شراء، بخس و تطفیف، امانت و خیانت، اسراف و تبذیر، بخل و شح، ربا و میسر، سرقے اور رشوت وغیرہ کا ذکر اور ان کے متعلق ایجابی و امتناعی احکامات ہیں، مذکورہ الفاظ میں سے ہر لفظ کا جو شرعی، عرفی اور لغوی معنی و مفہوم ہے انفرادی اور شخصی ملکیت اس کی ماہیت میں داخل اور اس کی حقیقت کا جز و لاینفک ہے۔ انسانوں کی انفرادی و شخصی ملکیت کا انکار کر دیا جائے تو ان الفاظ کا کوئی مطلب ہی باقی نہیں رہتا اور ان سے متعلق احکامات بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قرآنی تصورِ ملکیت بہر حال یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن حکیم اشخاص و افراد کی شخصی و انفرادی ملکیت ہر شے کے متعلق تسلیم کرتا اور اپنے تصور کے تحت اسے جائز قرار دیتا ہے خواہ وہ شے اشیائے صرف میں سے ہو یا ذرائع پیداوار میں سے اور ابتدائی طور پر اس کی بنیاد انسانی سعی و محنت کے مفید اثرات پر رکھتا ہے۔ بعض احادیثِ نبویہ کی روشنی میں قرآن مجید کے اس تصور ملکیت کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی شخص دوسروں سے سبقت کر کے سب سے پہلے کسی قدرتی شے کو اپنے تصرف میں لاتا اور اپنی سعی و محنت سے اس کی قدرتی افادیت میں ایک نئی افادیت پیدا کر دیتا ہے تو وہ شے اس کے انتفاع و استفادہ کے لئے مخصوص ہو جاتی اور اسے اس شے سے فائدہ اٹھانے کے حق میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اور اب دوسرا کوئی شخص اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھانے کا مجاز نہیں ہوتا، البتہ اگر وہ چاہے تو اپنی یہ ابتدائی ملکیت، بلا معاوضہ

یا بالمعاوضہ دوسرے کی طرف منتقل کرسکتا ہے مطلب یہ کہ سعی ومحنت کے مفید اثرات کی بنیاد پر کسی شخص کو کسی قدرتی شے کی جو ملکیت حاصل ہوتی ہے وہ ناقابلِ انتقال نہیں بلکہ قابلِ انتقال ہوتی ہے اور ایسے طریقوں سے دوسرے کی طرف منتقل ہوجاتی ہے جن میں پہلے مالک کی حقیقی رضامندی موجود ہوا کرتی ہے جیسے ہبہ وصدقے کا طریقہ، یا بیع وشراء کا طریقہ یا قرض وادھار کا طریقہ یا وصیت و وراثت کا طریقہ، یعنی ہر وہ طریقہ جس میں مالک کے لئے کوئی مادی یا روحانی اور دنیوی یا اُخروی بدل اور معاوضہ موجود ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ کسی ایسے طریقہ سے جب کوئی شخص اپنی مملوکہ چیز دوسرے کو دیتا ہے۔ تو اب وہ دوسرا شخص اس چیز کا مالک بن جاتا اور اسے اس چیز کے اندر ہر اس تصرّف کا اختیار حاصل ہوجاتا ہے جس کا مالک اوّل کو حاصل تھا۔

چنانچہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہل وسبقت کرکے قدرتی حالت پر پڑی ہوئی کسی بنجر وغیر آباد زمین کو قابل کاشت بناتا اور آباد کرتا ہے تو ان مفید اثرات کی وجہ سے جو اس شخص کی سعی وجہد اور محنت ومشقت سے وجود میں آئے اور اس قطعۂ زمین کے ساتھ قائم ہوگئے۔ وہ شخص قرآن مجید کے مذکورہ تصورِ ملکیت کی رو سے اس قطعۂ زمین کا مالک بن جاتا ہے۔ یعنی اس قطعۂ زمین سے انتفاع و استفادے کے حق میں اس کو دوسروں پر ترجیح وتخصیص حاصل ہوجاتی ہے اور اب دوسرے کسی کے لئے جائز نہیں ہوتا کہ وہ اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس قطعۂ زمین سے وہ فائدہ اٹھائے جو صرف ایک مالک کے لئے جائز ہوتا ہے یعنی دوسرا اس خطۂ زمین میں کوئی مالکانہ تصرّف نہیں کرسکتا۔ البتہ مالک کو اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی خوشی سے وہ زمین کسی دوسرے کو دیدے اور اس کے حق میں اپنی ملکیت سے دستبردار ہوجائے خواہ صدقہ وہبہ کے طریقہ سے یا خرید وفروخت اور تجارتی تبادلہ کے طریقہ سے، چنانچہ وہ اگر ایسا کرتا ہے تو اس کی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص غیر آباد زمین کو آباد کرنے اور قابلِ کاشت بنانے کے بعد کافی عرصہ تک چھوڑ دیتا ہے۔ تا آنکہ اس کی سعی ومحنت سے پیدا شدہ آبادی کے اثرات زائل ہوجاتے ہیں اور

زمین اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے تو اس شخص کو اس زمین کے متعلق جو ملکیت حاصل ہوئی تھی زائل وختم ہو جاتی ہے۔

پھر جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا قرآن مجید کے اس تصورِ ملکیت اور فلسفۂ ملکیت کے تحت جس طرح کوئی شخص کسی ایسی شے کا مالک قرار پاتا ہے جو نجی استعمال اور ذاتی صرف سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح ہر اس شے کا بھی مالک قرار پاتا ہے جو ذرائع پیداوار اور وسائل آمدنی سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اسلام دونوں قسم کی اشیاء کے متعلق شخصی ملکیت کو جائز تسلیم کرتا اور مانتا ہے، البتہ اشیائے صرف کے مالک کو جتنے تصرّف کی اجازت دیتا ہے اتنے تصرّف کی آزادی ذرائع پیداوار کے مالک کو نہیں دیتا۔ یعنی ذرائع پیداوار کے مالک کو ہر اس تصرّف کی اجازت دیتا ہے جو اس کے لئے مفید ہونے کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس کے لئے بھی مفید ہو۔ لیکن کسی ایسے تصرّف کی اجازت نہیں دیتا جو اس کے لئے مفید اور عامۃ الناس کے لئے مفید نہ ہو بلکہ مضر ہو۔ کیونکہ ذرائع پیداوار اپنی اصل بناوٹ وساخت کے لحاظ سے مفاد عام کے لئے ہوتے ہیں اور ان سے اصل مقصود اجتماعی فائدہ ہوتا ہے اور انفرادی فائدہ اس کے تابع، لہٰذا ان کے مالک کا ہر وہ تصرّف ناجائز اور غلط قرار پاتا ہے جو مفاد عام کے مخالف ومنافی ہو۔

زمین سے شخصی ملکیت سے متعلق جزوی دلائل اب تک جو کچھ کہا گیا وہ اس اصولی تصوّر سے متعلق تھا جو عام اشیاء کی شخصی وانفرادی ملکیت کے بارے میں قرآن مجید سے مفہوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس میں وہ اصولی تصوّر بھی واضح ہو گیا ہو گا اور یہ بھی کہ اس اصولی تصوّر کی رُو سے جس طرح کوئی شخص دوسری کسی شے کا مالک قرار پا سکتا ہے اسی طرح ایک قطعۂ زمین کا بھی مالک قرار پا سکتا ہے، گویا یہ واضح ہو گیا کہ ملکیت کے اس اصولی وکلّی تصوّر سے زمین کی شخصی ملکیت کا ثبوت کیسے فراہم ہوتا ہے اور اب میں وہ چند جزوی نصوص سامنے لانا چاہتا ہوں جو قرآن وحدیث میں خاص طور پر زمین کی شخصی ملکیت سے متعلق پائی جاتی اور اس کے ثبوت وجواز پر دلالت کرتی ہیں: مثلاً قرآن مجید میں سورہ الکہف کی آیت ہے:-

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝	"اور بیان کیجئے ان کے لئے بطور مثال قصہ دو آدمیوں کا جن میں سے ایک کے لئے ہم نے دو باغ انگوروں کے بنائے اور ان کے ارد گرد کھجوروں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کھیتی رکھی۔"

اس آیت میں لفظ " لِاَحَدِهِمَا " کے شروع میں لام چونکہ تملیک و تخصیص کے لئے ہے لہٰذا اس سے یہ مطلب پیدا ہوا کہ وہ دو باغ بمعہ کھیت و زرعی زمین کے اس ایک شخص کی ملکیت میں تھے اور وہ ان کا مالک تھا۔ پھر اس آیت سے متصل بعد کی آیات میں جو اس قصہ سے تعلق رکھتی ہیں اور بھی کئی ایسے الفاظ ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ باغ وغیرہ اس ایک شخص کی ملکیت تھے۔ مثلاً ایک یہ لفظ کہ " اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا " "میں مال میں تجھ سے زیادہ ہوں"۔ دوسرا یہ لفظ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ "اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا" اور تیسرا یہ لفظ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ "جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا۔

دوسری آیت سورہ الاحزاب کی یہ آیت ہے :۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا	"اور اللہ نے تمہیں یہود کی زمینوں، ان کے مکانوں اور ان کے مالوں کا وارث بنایا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم بھی نہ رکھا تھا۔"

اس آیت میں لفظ اَوْرَثَ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ترکِ وطن کے بعد یہودیوں نے پیچھے جو قطعات زمین، مکانات اور مختلف قسم کے اموال چھوڑے وہ پہلے یہود کی ملکیت تھے پھر مسلمانوں کی ملکیت قرار پائے کیونکہ وراثت کے لئے ضروری ہے کہ ایک چیز پہلے مورث کی ملکیت میں ہو اور پھر وارث کی ملکیت میں آئے، علاوہ ازیں ارض، دیار اور اموال کی اضافت یہودیوں کی طرف بھی یہ بتلاتی ہے کہ وہ ان کے مالک تھے بہرحال اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مکانوں

اور دوسرے مالوں کی شخصی ملکیت کی طرح زمین کی شخصی ملکیت بھی جائز ہے۔ زرعی زمین کی شخصی ملکیت کے متعلق تیسری آیت سورہ القلم کی یہ آیت ہے:

اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ	"اور یہ کہ صبح سویرے چلو اپنے
اِنْ کُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ ۝	کھیتوں پر اگر تم اسے کاٹنے والے ہو"

یہ آیت باغ والوں کے قصہ سے تعلق رکھتی ہے جو سورہ القلم میں بیان کیا گیا ہے کہ جب باغ اور کھیت تیار ہوا۔ پھل اور فصل کاٹنے کا وقت آیا تو انہوں نے اس خیال سے کہ اگر دن میں کٹائی کی تو مانگنے والے مسکین آجائیں گے اور ان کو کچھ دینا پڑے گا، یہ طے کیا کہ علی الصبح اندھیرے میں یہ کام کر لیا جائے تاکہ مسکینوں کو کچھ دینا نہ پڑے، ان کا یہ رویہ اللہ کی ناراضگی کا باعث بنا اور صبح سے پہلے رات ہی کو آفت سماوی نے ان کے باغ اور کھیت کو تہس نہس کر دیا۔ صبح جب وہاں پہنچے تو باغ و کھیت کو نہ پا کر آزردہ ہوئے اور آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور تائب ہو کر اعتراف کیا کہ ہم سے زیادتی اور سرکشی ہوئی ہے۔ بہر حال آیت مذکور میں لفظ حَرْثِکُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کھیت کے مالک تھے۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بعض حضرات نے زمین کی شخصی ملکیت کی نفی میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ "بے شک زمین اللہ کے لئے ہے" اور اس سے اسطرح استدلال کیا ہے کہ جب زمین اللہ کی ہے تو پھر اس کے کسی حصّے کا کوئی انسان کیسے مالک ہو سکتا ہے۔ گویا اس استدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ کسی شے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے اثبات سے انسان کی ملکیت کی نفی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ جیسا کہ پیچھے تفصیل کے ساتھ عرض کیا گیا کہ اللہ کی ملکیت کے معنی اور ہیں اور انسان کی ملکیت کے معنی اور، اور یہ کہ دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں اور دونوں بیک وقت ایک شے میں جمع ہو سکتے ہیں اور یہ کہ ایک ملکیت کے اثبات سے دوسری ملکیت کی نفی لازم نہیں آتی اور پھر اگر اس کو درست مان لیا جائے تو پھر دنیا کی

کوئی شے بھی خواہ اس کے ذاتی استعمال ہی کی کوئی شے کیوں نہ ہو انسان کی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات ہیں جو یہ بتلاتی ہیں کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے یعنی کائنات کی ہر ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے اور تنہا وہی ہر شے کا مالک حقیقی ہے۔ حالانکہ زمین کی شخصی ملکیت کی نفی کرنے والے حضرات بے شمار چیزوں کی شخصی و انفرادی ملکیت کو مانتے اور جائز تسلیم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آیت مذکورہ ہماری زیر بحث زمین کی شخصی ملکیت سے تعلق ہی نہیں رکھتی بلکہ اس کا تعلق ملکی اقتدار حکومت سے ہے جس قرآنی آیت کا یہ ایک درمیانی ٹکڑا ہے۔ وہ پوری آیت سورہ الاعراف کی آیت نمبر ۱۲۸ ہے اور اس کا ترجمہ اس طرح ہے "حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا" اللہ سے مدد چاہو اور صبر سے کام لو۔ اور یقین جانو کہ زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جنہیں چاہتا اس کا وارث بناتا ہے۔ اور یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ عاقبت اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لئے ہے۔

اس آیت میں جس وراثت ارضی کا ذکر ہے وہ استخلاف فی الارض اور ملکی اقتدار کے ہم معنی ہے، اس کا اظہار اس آیت سے متصل بعد والی آیات سے بھی ہوتا ہے مثلاً اس سے متصل پہلی آیت کا ترجمہ ہے "قوم کے لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا ہم آپ کے آنے سے پہلے بھی ستائے گئے اور آنے کے بعد بھی، اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا" شاید تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین کی خلافت عطا فرمائے اور دیکھے کہ تم کیا روش اختیار کرتے ہو"۔ پھر آیت نمبر ۱۳۷ کا ترجمہ ہے "اور ہم نے وارث بنایا اس قوم کو جس کے افراد کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں۔ مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ قوم سے مراد بنی اسرائیل اور ارض سے مراد سرزمین فلسطین ہے اور وراثت سے مراد اس ملک کی حکومت ہے جو ان کو ملی تھی۔

وراثتِ ارض سے مراد ملک کی حکومت و خلافت ہے اس کا اظہار سورہ الانبیاء کی اس آیت سے بھی بخوبی ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ	"اور بے شک ہم نے زبور میں
مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ	ذکر کے بعد لکھا کہ بلاشبہ اس سے
الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ	زمین کے وارث ہوں گے ہمارے
الصَّالِحُونَ ۝	صالح و نیک بندے۔"

یہ اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کو زمین کا وارث بنانے کا مطلب ہے اس قوم کو اس سے پہلی قوم کی جگہ جو اپنی بداعمالیوں اور غلطیوں کی وجہ سے ذلیل و خوار اور تباہ و برباد ہوئی، ملک کا اقتدار دینا اور زمین کا خلیفہ و حاکم بنانا۔ لہٰذا اس قسم کی قرآنی آیات کو نہ ہماری زیرِ بحث زمین کی شخصی ملکیت کے اثبات میں پیش کرنا درست ہے اور نہ اس کی نفی و انکار میں۔

اسی طرح جو حضرات زمین کی شخصی ملکیت کو نہیں مانتے اپنی رائے کی تائید میں قرآن مجید کی اس آیت کو بھی پیش کرتے ہیں جو سورہ الرحمٰن میں اس طرح ہے۔

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ	"اور زمین کو اللہ نے خاص طرح
	سے بنایا اور رکھا مخلوقات کے فائدہ
	کے لئے۔

حالانکہ اس آیت سے نہ زمین کی انفرادی ملکیت کی نفی ہوتی ہے اور نہ اجتماعی ملکیت کا اثبات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اَرض سے مراد پوری زمین اور اَنام سے مراد تمام زندہ و جاندار مخلوق ہے وہ انسان ہوں یا غیر انسان، اور آیت کا مطلب ہے اللہ نے زمین کو اس انداز سے بنایا اور اس کا نظام اس طرح سے قائم کیا ہے کہ اس سے تمام جانداروں کو زندہ رہنے نشوونما پانے اور فائدے اٹھانے کا سروسامان ملے، اور یہ مطلب ایک ایسی روشن حقیقت ہے جس کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے۔ زمین کے کسی خاص خطے کے متعلق کسی کی شخصی و انفرادی ملکیت نہ اس مطلب کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہے اور نہ اس کے منافی و مخالف لہٰذا آیت مذکورہ کو نفی ملکیت زمین کے ثبوت میں پیش کرنا کسی طرح صحیح و درست نہیں بلکہ یہ ایک بڑی ناسمجھی اور زیادتی کی بات ہے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ : حرفِ اوّل

مقالے "مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام" کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ اصحابِ علم سے گذارش ہے کہ وہ کھلے قلب و ذہن کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمائیں۔ اور اگر کہیں استدلال کی کڑیوں میں کوئی خلاء یا کجی محسوس کریں تو خالصتہً احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے جذبے سے قلم اٹھائیں ـــــ 'حکمتِ قرآن' کے صفحات ان کے لئے حاضر رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق ہی دکھلائے اور اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور باطل کو باطل ہی دکھلائے اور اس سے اجتناب کی ہمت مرحمت فرمائے۔ آمین!

انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمی
کے مقاصد کی وضاحت کے لئے مطالعہ فرمائیں

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

از قلم :ـــ ڈاکٹر اسرار احمد

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 1	JANUARY 1983	No. 11

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ